پرچھائیں

دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی داستان اس لڑکے کی کہانی
جس کی صورت ایک امیرزادے سے مشابہ تھی

ایم اے راحت



کیا سیارے ہمارے قرب و جوار میں ختم ہوتی ہیں اور

کچھ عرصہ میں سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسانی

مسائل ہی سمجھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ نیکی، بدی، کچھ اسی

معاشرے کو اپنے غلط کردار سے بدنما بنا رہے

کے خواہاں۔ اور کچھ اپنی فطرت کی نیکی سے رنگین

ناکام بنانے کی کوشش میں۔ پھر وقت اور حالات

بھی متعین کر رہے ہیں۔ بدی نیکی پر کیا اثر پڑتی ہے

اس کے سامنے عقل کی قوتیں پڑتی ہیں۔ نیکی نیکیوں

کا تحفظ شب و شعر ہے۔ اور انسان کامیابی —

"یہی کہانی بڑی ہے۔ چنانچہ "مرحبا ہیں

خوشی نظریے کی مثال سے ہے۔ امید ہے گا۔"

ایم۔ آر۔ کیانی احمد

پوری زندگی گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا تھا اس لئے کراچی جانے کے تصور سے دل کانپ رہا تھا۔ ویسے کراچی کی رنگین داستانیں دل لبھاتی تھیں۔ چوہدری اللہ وسایا کا بیٹا گلو بھی تو کراچی ہی میں تھا اور جب پورے ایک سال کے بعد وہ کراچی سے چک پہنچا تھا تو دھوم مچ گئی تھی۔ سب کے سب اس سے ملنے گئے تھے.... اور چوہدری غلام علی جیسے مغرور آدمی نے گلو کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا تھا۔

گلو میرا بچپن کا دوست تھا اور جب وہ ایک سال کے بعد چک پہنچا تو میں بھی بے اختیار اس سے ملنے چلا گیا تھا لیکن گلو بدل گیا تھا لنگی کی جگہ پتلون نے لے لی تھی۔ بیڑی کی جگہ یہ لمبے لمبے سگریٹ پیتا تھا۔ کلائی پر خوبصورت گھڑی بندھی تھی اور وہ ایک ایک سے انگریزی بول رہا تھا۔ میں تو اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ گلو مجھ سے اس خلوص سے نہیں ملا جس طرح ملتا تھا۔ اس لئے طبیعت تھوڑی سے مکدر ضرور ہوئی لیکن سب ٹال رہے تھے۔ میں بھی ٹال گیا۔ وہ پندرہ دن گاؤں میں رہا آٹھ دس دن کے بعد ٹھیک ہو گیا تھا اور اس کے بعد جو اس نے کراچی کے قصے سنائے تو نوجوان دل مسوس کر رہ گئے۔ سب سوچ رہے تھے کہ کاش وہ بھی گلو کی طرح کراچی جا سکتے۔

دوسرے سال گلو پھر گاؤں پہنچا تھا اور پھر وہ نورالنسا عرف نوری سے شادی کرکے دوبارہ کراچی چلا گیا۔ نوراں کو وہ گاؤں ہی چھوڑ گیا تھا۔ کراچی کے خواب صرف میری ہی نہیں بہت سے دوستوں کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ بہرحال اس کے بعد جو بھی کبھی کراچی گیا۔ واپسی میں اس نے ایسی انوکھی کہانیاں سنائیں کہ کراچی ہمارے لئے خوابوں کا شہر بن گیا۔ میں نے بھی کراچی کے خواب بہت دیکھے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ مجھ جیسے لوگ کراچی نہیں جاتے۔

لیکن تقدیر کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے۔ حالات نے میرے لئے بھی راہ نکال ہی دی۔ تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ گھر میں ہم پانچ افراد تھے۔ میری ماں، باپ دو بہنیں اور میں۔ ہم دونوں باپ بیٹے اس چھوٹی سی زمین سے روزی حاصل کرتے تھے لیکن گزارا مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ خون پسینہ ایک کرکے بس اتنا ہی ملتا تھا کہ سال کے آٹھ مہینے تو آرام سے گزریں اور چار مہینے کسمپرسی کے عالم میں۔

میں تو بچپن ہی سے آزاد فطرت کا مالک ہوں لیکن بابا کی کمر روز بروز جھکتی جا رہی تھی خاص طور سے بہنوں کا خیال انہیں مارے ڈال رہا تھا کیونکہ گاؤں کی ساری ہوائیں ان کے جسموں میں جاکر انہیں غبارے کی طرح پھلا رہی تھیں اور دونوں میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ پہلے کون جوان ہو۔

لیکن ان کی جوانی کا بوجھ بابا کی کمر پر پڑ رہا تھا اور وہ روز بروز جھکتی جا رہی تھی۔ اس نے نظر بھر کر دونوں بیٹیوں کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اکثر وہ مجھ سے سوال کرتا کہ ان کا کیا ہوگا۔ ان کے لئے تو پھوٹی کوڑی بھی جمع نہیں ہوسکی۔ اب اگر کوئی رشتہ مل گیا تو کیا کریں گے خیال مجھے بھی تھا لیکن میرے پاس جواب کہاں تھا۔

ہاں اس وقت میں الجھن میں پھنس گیا جب اچانک بابا فالج کا شکار ہوگیا۔ حکیم دوا دارو اور نہ جانے کیا کیا۔ ساری زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ بابا لاکھ منع کرتا لیکن ہم اسے موت کے حوالے تو نہیں کرسکتے تھے۔

تقدیر ہماری چھوٹی سی زمین بھی کھا گئی۔ سب کچھ بابا کی بیماری پر لگ گیا۔ ہم نے بابا کو تو بچا لیا لیکن خود ہماری زندگیاں ہم پر بوجھ بن گئیں۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ کوئی نوکری نہیں تھی۔

ایسے نازک وقت میں زمیندار کلیم علی نے ہماری مدد کی۔ اس نے بابا کو اپنے گھر کے کام کاج کے لئے نوکر رکھ لیا اور میرے لئے تجویز پیش کی کہ میں کراچی چلا جاؤں اور وہاں جاکر قسمت آزماؤں۔

کلیم علی ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ گھر والوں کو دو وقت روٹی ملنے لگی



تھی۔ جس کا کوئی اور آسرا نہیں تھا اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔ میرا رواں رواں کلیم علی کا احسانمند تھا۔ اس فرشتہ صفت آدمی نے مجھے کراچی جانے کے لئے کچھ رقم بھی دی تھی۔ وہ خلوص دل سے ہماری مدد کر رہا تھا اس زمانے میں کسی کی بے غرض مدد ممکن نہیں ہے لیکن چوہدری کلیم علی ہمیشہ کا نیک انسان تھا۔

یہ سب کچھ تو تھا لیکن کراچی جانے کا تصور میں نے تو کبھی طویل سفر نہیں کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے چک سے دوسرے چک لیکن اب اتنا لمبا سفر کرنا تھا اور وہ بھی کراچی کا۔ ریل کی پٹری ہمارے گاؤں کے سامنے سے ضرور گزرتی تھی لیکن اسٹیشن نہیں تھا۔ ایک بار ایک خراب بوگی ریلوے لائن سے اتار کر یہاں ڈال دی گئی اسے اندر سے ضرور دیکھا تھا اور بس لیکن اب ریل میں بھی بیٹھنا تھا۔

بہرحال سامان کی پوٹلی بندھ چکی تھی۔ نصیحتوں کی پوٹلی باندھی جا رہی تھی۔ "اپنے کاندھوں پر ہمیشہ دو بہنوں کا بوجھ محسوس کرنا۔ ہمارا تنہا سہارا ہو۔ تمہاری ذرا سی غلطی چار زندگیوں کا خون کر دے گی۔ کراچی طلسمی شہر ہے۔ اس کے طلسم میں مت کھو جانا۔"

اس قسم کی ہزاروں نصیحتیں پھر فرمائشیں۔

"بھیا' جب آؤ تو میرے لئے جھمکے ضرور لانا" نسیمہ نے کہا۔ "میرے لئے بھی ایک چیز لے آنا بھیا۔" زرینہ نے شرارت سے کہا۔ یہ میری لاڈلی بہن تھی اور شریر بھی بہت تھی۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کان میں بتاؤں گی۔ زرینہ بولی اور میں نے کان جھکا لیا۔

"کراچی کی ایک خوبصورت سی بھابھی۔"

"کہوں ابا سے؟" میں نے اسے گھورا۔

"فرمائش میں نے تم سے کی ہے ابا سے کیا کہو گے؟" وہ بھی آنکھیں نکال کر بولی۔

"کل تو کہے گی کہ میرے لئے بھی کراچی سے کوئی خوبصورت سا دولہا لے آنا تو...." میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ زرینہ بھاگ گئی۔

بہرحال آخری وقت آ گیا۔ زمیندار صاحب کی بیل گاڑی مجھے لے کر چل پڑی۔ ابا اور ایک آدھ دوست ساتھ تھے جو مجھے چک نمبر۲ کے چھوٹے سے اسٹیشن چھوڑنے آئے۔ میرے دوستوں نے مجھے کراچی دیکھنے کی پرخلوص مبارکباد دی تھی اور پھر میرے لئے ٹکٹ خریدا گیا باقی رقم کمر کے نیچے احتیاط کے ساتھ باندھ لی گئی اور میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔

بڑے بڑے بابو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری تو ہمت ہی نہیں پڑی کہ کسی کے ساتھ بیٹھوں اور پھر جگہ بھی کم تھی۔ چنانچہ اپنی پوٹلی ایک جگہ رکھ کر میں بیٹھ گیا۔ عجیب حالت تھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سارے لوگ مجھے گھور رہے ہوں اور میں پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

ٹرین کھسکی تو ابا نے آنسو بھری آنکھوں سے خدا حافظ کہا۔ یہ آنسو میرے دل پر گرے تھے اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ابا کا بوجھ ضرور بانٹوں گا۔ کراچی جا کر سخت محنت کروں گا اور خوب روپیہ کما کر بھیجوں گا۔ بہرحال ٹرین چل پڑی لیکن ڈبہ تو اپنی جگہ موجود تھا۔ میں تو جہاں بیٹھا تھا وہیں کا وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ تجسس نے سر ابھارا تو جھانک کر باہر دیکھا اور سوچا کہ لوگ فضول باتیں کرتے ہیں۔ ٹرین کہاں چلتی ہے اصل میں تو زمین دوڑتی ہے۔

اسٹیشن آتے رہے ٹرین رکتی رہی دوڑتی رہی یا زمین دوڑتی رہی اور ٹرین بدنام ہوتی رہی۔ کچھ بھی ہوا ہو میں کراچی پہنچ گیا۔ زمین کی دوڑ مجھے ہنگاموں کی بستی میں لے آئی لیکن یہ بستی تھی۔ جس کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔

راستے بھر میں نے منصوبے بنائے تھے۔ ایک کے بعد ایک خیال ذہن میں آتا رہا تھا۔ کراچی جاؤں گا۔ کام کروں گا۔ گلو کو تلاش کروں گا۔ وہ تو بابو ہے۔ نہ جانے بابو کیسے بن گیا اس سے پہلے تو میرے جیسا تھا۔ ممکن ہے میں بھی بابو بن جاؤں۔ ممکن ہے کراچی آنے کے بعد ہر شخص بابو بن جاتا ہو۔

لیکن جس جگہ سارے لوگ اترنے لگے وہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ انسانوں کا ایک عظیم ہجوم تھا۔ اتنا بڑا ہجوم تو میلوں میں نظر آتا تھا۔ لیکن یہاں تو کوئی میلہ نہیں تھا۔ نہ ہی سرکس تھا نہ جھولے پھر بھی اتنے سارے لوگ موجود تھے۔

میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اتنا حیران ہو گیا تھا کہ کراچی کے بارے میں جتنی داستانیں سنی تھیں سب میرے ذہن سے نکل گئی تھیں۔ بس میں پاگلوں کی طرح ایک ایک چیز دیکھ رہا تھا۔ بچپن میں جادو کے شہروں کے بارے میں جتنی کہانیاں سنی تھیں سب میرے ذہن میں جاگ اٹھی تھیں۔

بہرحال حیرت کا یہ وقفہ خاصا طویل تھا۔ ریلیں آتی جاتی رہیں۔ تب میں نے سوچا یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ اب تو جادونگری میں آ ہی گئے ہو تو آگے بڑھو.... اور میں آگے بڑھنے لگا۔ جس طرف سے دوسرے لوگ آ جا رہے تھے۔ میں بھی اسی طرف بڑھ گیا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔

باپ رے باپ! میلے کی وہی جگہ نہیں تھی۔ باہر بھی میلہ ہی تھا۔ موٹریں دوڑ رہی

تھیں۔ ان سڑکوں پر انسان کس طرح زندہ رہتا ہوگا۔ میں نے سوچا لیکن مجھے لاشیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس لئے لوگ زندہ ہی رہتے ہوں گے لیکن اس طرح کام نہیں چلے گا۔ یوں بے وقوف بنا رہا تو کیا کر سکوں گا۔ بزرگوں کا کہنا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔ آخر اپنے وطن کا شہر ہے اپنے ہی بھائی بند ہیں ابھی مجھے نہیں جانتے جب جان لیں گے تو میں یہاں اجنبی نہیں رہوں گا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کسی سے شناسائی حاصل کی جائے اور اس کے لئے میں مناسب آدمی کا انتخاب کرنے لگا۔

تھوڑا سا اور آگے بڑھ آیا تھا۔ تب میں نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ "بھائی صاحب اور بھائی صاحب۔" وہ شخص رکا۔ مجھے دیکھا اور نفرت سے منہ بنا کر آگے بڑھ گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔

یہ کیا ہوا۔ میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ سیدھی سادی تو بات کی تھی۔ اس میں نفرت کی کیا بات تھی۔ نہیں بھائی یہ کراچی اپنی سمجھ میں آنے کی چیز نہیں تھی۔ بالکل نہیں تھی.... لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے سوچا یہاں سے کچھ دور چل کر اس سلسلہ میں کوئی کوشش کروں گا.... چنانچہ میں آگے بڑھنے لگا۔

اور پھر وہاں سے کافی دور نکل آیا۔ بیچ سڑک پر گاڑیاں چل رہی تھیں اس طرح پاس سے گزر جاتی تھیں کہ میں دیکھتا رہ جاتا تھا۔ اس لئے اب سڑک سے کافی نیچے اتر کر چل رہا تھا۔ سڑک تھی کہ شیطان کی آنت نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی۔ سب سے زیادہ حیران کرنے والی چیز یہاں کے مکانات اور دوکانیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس جادونگری کا کیا بھید تھا اور یہاں رہنے والے کیسے تھے؟

بڑی مشکل سے ایک بار پھر ہمت کی اور ایک تنہا شخص کو روکا۔ "بھائی صاحب۔" میں نے آواز دی اور وہ رک گیا.... لیکن چہرے پر کوئی ملائمت نہیں تھی۔ ہونٹ مسکراہٹ سے عاری تھے۔

میں قریب پہنچا تو اس کا چہرہ کچھ اور خشک ہو گیا۔ ہمت جواب دینے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے گلا صاف کیا۔

"بھائی صاحب.... میں...."

"ہاں۔" میں نے زور سے گردن ہلائی۔

"اور تمہاری جیب کٹ گئی اب تمہارے پاس واپسی کے پیسے نہیں ہیں۔ کیوں؟" اس نے کہا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے گھبرا کر اپنی پوٹلی ٹٹولی جس میں میری رقم محفوظ تھی۔ یہ شخص کیا بکواس کر رہا تھا۔

"بھائی صاحب وہ ...." میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے پھر میری بات کاٹ دی۔

"شرم نہیں آتی تمہیں۔ ذلیل...." اور اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھ گیا۔ میں حیرانی سے سر کھجا کر رہ گیا۔ دیکھنے میں تو مرد ہی معلوم ہوتا تھا۔ یہ بات تو لڑکیاں اس وقت کہتی ہیں۔ جب کوئی راستے میں انہیں چھیڑ دے۔

ارے باپ رے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ ضرور گڑبڑ ہو گئی۔ گلو نے کہا تھا کہ کراچی میں مردوں اور عورتوں کی پہچان بڑا مشکل کام ہے۔ اکثر مرد بالکل لڑکی نظر آتے ہیں اور لڑکیاں مرد۔ تو کیا وہ کوئی عورت تھی۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تو واقعی غلطی ہو گئی مگر مونچھیں ہاں مونچھیں بھی تو تھیں۔ تو کیا کراچی کی عورتیں مونچھیں بھی اگا لیتی ہیں مگر کس طرح۔ مونچھوں کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن میں اس صورت حال سے بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے اس نے گڑبڑ نہیں کی۔ اگر بات زیادہ بگڑ جاتی تو....!

اب تو بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ مردوں اور عورتوں کی تمیز بھی نہ ہو سکے تو مصیبت یقینی ہے لیکن اب کہاں تک چلوں۔ سڑک تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور اس کے دونوں طرف بنے ہوئے مکانات۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ شام بھی جھک آئی تھی' روشنیاں جلنے لگی تھیں' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے' میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس عظیم الشان شہر میں مجھے اس آسمان کے نیچے کہاں پناہ مل سکے گی۔ میں نے سوچا اور اتنے سارے لوگوں میں تو گلو کی تلاش بھی مشکل ہے' جو فی الوقت میرا سہارا بن سکتا تھا۔ گاؤں سے چلتے ہوئے مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ گلو کا پتہ معلوم کر کے اس کے پاس قیام کروں' میرے گھر والے بھی اس حقیقت سے ناآشنا تھے' وہ نہیں جانتے تھے کہ کراچی میں گلو کا پتہ معلوم کرنا کتنا مشکل کام ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے بھی بڑے آرام سے کہہ دیا تھا۔ اگر یہاں آتے تو پتہ چلتا کہ یہاں گلو جیسے لوگ اس طرح غائب ہوتے ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں سے ایک مکھی۔

کافی دیر گزر گئی' بھلا میں زیادہ تیز رفتاری سے سفر کیسے کر سکتا تھا۔ چلتا رہا' چلتا رہا۔ سڑکوں کی کوئی حد نہیں تھی نجانے کہاں کہاں پھیلی ہوئی تھیں' عجیب و غریب راستے تھے' ایسے کہ عقل دیکھ کر حیران ہو جائے' بہرحال ان راستوں کو تو طے کرنا ہی تھا۔ بہت دیر تک میں نے اپنا سفر جاری رکھا اور اس کے بعد اچانک بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہلکی لیکن اس کے بعد تیز۔ خوب تیز۔

ذرا سی دیر میں' میں بھیگ گیا اور دوسرے لمحے میں نے ایک عمارت کی طرف دوڑ لگائی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ اب کھلی جگہ میں گزارا ممکن نہیں تھا چنانچہ اس بوسیدہ سی

عمارت میں' میں اندر تک چلا گیا۔ پناہ کی تلاش تھی۔

پھر ایک سائبان کے نیچے میں رکا لیکن خدا کی پناہ۔ باہر سے بوسیدہ نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے کس قدر حسین تھی اتنی خوبصورت کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سے کمروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

بہرحال میں بارش سے بچ گیا.... لیکن بچ کیا گیا۔ پورا بدن شرابور ہو رہا تھا۔ پانی ٹپک رہا تھا لباس سے مجھے۔ اپنی بے بسی پر بڑی پریشانی ہوئی۔ کپڑے پوٹلی میں تھے لیکن پوٹلی بھی بھیگ گئی تھی۔

کافی وقت گزر گیا۔ بارش اسی زورشور سے جاری تھی اور کم ہونے کا نام نہیں لے رہ تھی۔ بہرحال رات یہاں گزاری جا سکتی ہے۔ میں نے سوچا اور پھیل کر بیٹھ گیا۔



نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ دفعتاً ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک موٹی سی عورت باہر نکل آئی۔ یہ تو سو فیصد عورت تھی لیکن اس نے مجھے دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اور واپس اندر گھس گئی۔ دروازہ زور سے بند ہو گیا تھا۔ میں بوکھلا گیا۔ یہ مصیبت آئی۔

مصیبت کو آنا تھا سو آ گئی اور تنہا نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ دو تین لمبے تڑنگے مسٹنڈے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں مڑی ہوئی لکڑیاں تھیں۔

"گھیر لو۔ پکڑ لو۔ بھاگنے نہ پائے۔" وہ آوازیں لگانے لگے لیکن دور ہی دور سے نہ جانے وہ کس سے یہ بات کہہ رہے تھے۔

"ابھی پولیس آ جائے گی۔ فون کرو۔ ارے مار مار کر بھیجہ نکال دو سالے کا۔" وہ بے وقوفوں کی طرح چیخ رہے تھے اور میں حیرانی سے ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے بارے میں یہ باتیں کہہ رہے تھے۔

پھر موٹی عورت نے دروازے میں سے گردن نکالی۔ "پکڑ لیا...." وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی نہیں مگر جائے گا کہاں سالا۔ ابھی پولیس آتی ہے آپ نے فون کر دیا۔"

"اوہ۔ کمبخت فون ڈیڈ ہے۔ لائن خراب ہو گئی۔" عورت کی آواز ابھری اور میں اٹھ کھڑا ہوا.... لیکن جونہی میں کھڑا ہوا ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

"پکڑو.... پکڑ لو۔ پکڑ لو۔" کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں لیکن کون کسے پکڑ رہا تھا۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ موٹی عورت نے دروازہ بند کر لیا تھا اور پھر دروازے کے پیچھے سے اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"پکڑ لیا...."

"نہیں' مالکن۔ پستول ہے سالے کے پاس۔"

"پستول...." آواز ایک دلدوز چیخ کی شکل میں ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔ اسی وقت باہر سے روشنیاں نظر آئیں اور ایک موٹر عمارت کے سائبان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"صاحب آ گئے۔ صاحب آ گئے۔" وہ آوازیں پھر ابھریں۔

"کیا بات ہے کیا ہو رہا ہے؟" صاحب مجھے اور ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔

"چور ہے صاحب۔ ہم اسے پکڑ رہے ہیں۔" کسی نے کہا اور صاحب بھی جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ مجھے گھور رہے تھے اور یہ بات اب میری سمجھ میں آئی تھی کہ وہ

مجھے چور سمجھ رہے ہیں اور اتنی دیر سے مجھے ہی پکڑا جا رہا ہے۔

"چور ہے تو پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟"

"فون خراب ہے صاحب۔"

"تو پھر اسے پکڑ لو۔ میں اسے پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔"

"مگر صاحب میں چور نہیں ہوں۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ اور صاحب جتنا آگے آئے تھے اتنا ہی پیچھے ہٹ گئے۔

"چور نہیں ہو تو یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بارش ہو رہی تھی جی۔ بارش سے بچنے کے لئے یہاں آ گیا۔"

"اور رات گہری ہونے پر اندر گھس جاتے کیوں۔ میں تم لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔" صاحب نے ذہانت کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں جی۔ بارش ختم ہوتی تو باہر چلا جاتا۔" میں نے جواب دیا۔

"چلو بھاگو۔ یہاں سے یہ کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں ہے' چلو" صاحب گرجے اور میں پوٹلی سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہ۔ اس پوٹلی میں کیا ہے؟"

"میرے کپڑے ہیں جی۔"

"اچھا نکلو یہاں سے۔ مع سازوسامان کے بسیرا کرنے آئے تھے۔ میں کہتا ہوں تم جاتے ہو یا میں تمہیں گولی مار دوں؟" صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اب نہ جانے پستول تھا بھی یا نہیں دھمکیاں دے رہے تھے۔ بہرحال پہلا تجربہ ہوا تھا۔ کراچی والوں کا اخلاق اتنا خراب ہے یہ گلو نے نہیں بتایا تھا۔

بارش اب ہلکی ہو گئی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ اپنے پیچھے ان بداخلاق لوگوں کو نہ جانے کیا کیا بکواس کرتے چھوڑ آیا تھا۔

سڑکوں پر پانی جمع ہو گیا تھا لیکن پکی سڑکیں تھیں۔ اس لئے زیادہ دقت نہیں ہو رہی تھی۔ میں چلتا رہا اور رات کا نہ جانے کون سا پہر بیت گیا۔ نہ جانے میں کہاں پہنچا اس وقت مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اب تو کسی عمارت کے سائے میں پناہ لینے سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

پھر مجھے ایک قبرستان نظر آیا اور میں نے گہری سانس لی قبرستان میں چند درخت بھی تھے ایک درخت کے نیچے ایک مکان بھی نظر آیا تھا۔ یہی درخت ایسا تھا جس کے سائے میں' میں پناہ لے سکتا تھا۔ یوں بھی بری طرح تھک گیا تھا اور اب مزید چلنے کی ہمت نہیں

تھی۔ میں تھکا ہارا بیٹھ گیا۔

لیکن رنگین کراچی کی بدنمائی نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ درخت کے نیچے بنے ہوئے مکان کے دروازے پر دو آدمی نظر آئے جو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ تھوڑی دیر تک کھڑی رہی اور پھر چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ ایک موٹر سائیکل آئی اور اس سے اترنے والوں نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی نکلا۔ پھر اندر چلا گیا پھر واپس آ گیا اور موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ ہو گئی لیکن اس کی تیز روشنی میرے اوپر پڑی تھی اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ موٹر سائیکل بھی چلی گئی لیکن ابھی اسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً عقب سے میرے اوپر مصیبت ٹوٹ پڑی۔

تھپڑوں لاتوں اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی اور میرے حواس جواب دے گئے۔ میرے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔

پہلے تو مجھے خوب مارا گیا پھر کئی آدمی مجھے پکڑے ہوئے مکان کے اندر لے گئے۔ باہر سے یونہی سا نظر آنے والا یہ مکان اندر سے کشادہ اور روشن تھا۔ ایک بڑے سے کمرے کے پکے فرش پر مجھے دھکا دے دیا گیا۔

"اوہ۔ رمضانی استاد میں اسے پہچانتا ہوں۔ مشکوک آدمی ہے۔ میں نے اکثر اسے کرامتے کے پاس دیکھا ہے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"رمضانی سے واقف نہیں ہے کیا؟" ایک اور شخص نے غراتے ہوئے کہا۔ ٹھگنے قد کا بے حد خطرناک صورت آدمی تھا۔ چہرے پر زخموں کے کئی نشان تھے۔ اس کی آواز بھی بے حد خوفناک اور بھاری تھی۔

"کیوں؟ کس نے لگائی ہے تمہاری ڈیوٹی؟" دوسرے آدمی نے پوچھا۔

"کیسی ڈیوٹی صاحب؟"

"بنو مت۔ رمضان کی آنکھوں میں کوئی دھول نہیں جھونک سکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم کمیشن دیتے ہیں۔"

"بھائیو۔ میرا نام سردار علی ہے۔ چک نمبر بارہ کا رہنے والا ہوں۔ کراچی نوکری کی تلاش میں آیا ہوں۔ بارش سے بچنے کے لئے جب کہیں پناہ نہیں ملی تو یہاں آ بیٹھا تھا۔ میں تمہیں کوئی...."

"سنا بھئی۔ یہ چک نمبر بارہ سے آیا۔ اسے چک نمبر تیرہ میں پہنچا دو صبح کو دیکھیں گے۔ یہ دھندے کا وقت ہے۔" رمضان نے قہقہہ لگا کر کہا اور چند لوگوں نے مجھے پکڑ لیا



پھر اسی عمارت میں سیڑھیوں کے ذریعے نیچے لے جایا گیا اور ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔

کراچی واقعی رنگین جگہ ہے۔ میں نے سوچا لیکن یہاں کے رنگ نرالے ہیں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال۔ یہ سکون کی جگہ تھی' حالانکہ کافی مار پڑی تھی لیکن میرے توانا بدن نے ان چوٹوں کا زیادہ اثر نہیں قبول کیا تھا۔ میں نے بند دروازے کو دیکھا اور پھر اسے اندر سے بھی بند کر لیا۔ اس کے علاوہ اندر آنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑے اتار دیئے پوٹلی ان کمبختوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھی ورنہ دوسرے کپڑے پہن لیتا۔ مجبوراً انہیں کپڑوں کو نچوڑ کر پہن لیا۔

سخت نیند آ رہی تھی۔ اس لئے فرش پر لیٹ کر سو گیا.... صبح کو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دن کو نا جانے کس وقت آنکھ کھلی۔ بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔ پہلے تو لیٹا رہا۔ پھر سوچا کچھ کرنا چاہئے۔ ورنہ بھوک سے ہی مر جاؤں گا۔ تب میں نے دروازہ اندر سے کھولا اور اسے زور زور سے پیٹنے لگا۔ دیر تک دروازہ پیٹتے رہنے کے بعد کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر دروازے میں ایک کھڑکی کھل گئی۔ ایک پتلی سی درز تھی۔ جس سے کسی عورت کی صورت نظر آئی۔

"کیا ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو رمضان تمہاری انتڑیاں نکال دے گا۔"

"میں بھوکا ہوں۔"

"تو یہاں کیا تمہارے باوا نے ہوٹل کھول رکھا ہے؟"

"میری پوٹلی میں ستو اور گڑ رکھا ہے وہ دے دو۔"

"پوٹلی رمضان کے پاس ہے۔"

"تو رمضان کو بلا دو۔"

"وہ سو رہا ہے۔"

"جگا دو اسے۔ میں بھوکا ہوں اور جب مجھے بھوک لگتی ہے تو میں کچھ نہیں دیکھتا۔"

مجھے واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

"مرتا رہ اسی طرح میرا کیا ہے۔ اگر دروازہ پیٹا تو بن موت مارا جائے گا۔ رمضان کی نیند خراب ہو جائے تو وہ کسی کو نہیں چھوڑتا۔" عورت نے درز بند کی اور پھر چلی گئی۔ میری بھوک بڑھتی جا رہی تھی اور پارہ بھی چڑھ رہا تھا۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہو گئی تو میں ایک بار پھر اٹھا اور میں نے پوری قوت سے دروازے پر اپنے بائیں شانے پر ٹکر ماری۔ اس ٹکر سے تو پورے گاؤں کے لوگ گھبراتے تھے۔ دروازہ چرچرایا اور اس کا ایک کواڑ الگ ہو گیا میں بپھرے ہوئے تیندوے کی طرح باہر نکل آیا تھا۔

لیکن سامنے ہی دو آدمی نظر آئے جو ایک پیٹی میں بوتلیں بھر رہے تھے۔ وہ اس طرح اچھلے کہ بوتلیں ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئیں اور کوئی سرخ سا پانی فرش پر بہنے لگا۔ دوسرے لمحے وہ سنبھل گئے۔

"پکڑلو سالے کو۔ مارو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "دیکھو" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ کئی گھونسے کھائے میں نے ان کے اور پھر خود بھی ہاتھ گھما دیا۔ اب مجبوری تھی۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ ایک ہی ہاتھ کافی تھا اس شہری بابو کے لئے وہ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور پھر کھڑا نہ ہو سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر دوسرے کو پکڑ لیا اور پھر اسے بھی دیوار پر دے مارا۔

لیکن اسی وقت سیڑھیوں پر قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر دو آدمی نیچے اترتے نظر آئے۔ ان میں ایک تو رمضان تھا اور دوسرا کوئی بابو۔ رمضان نے حیرت سے اکھڑے ہوئے دروازے کو دیکھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" وہ دھاڑا اور دوسرے لمحے پستول نکال لیا لیکن بابو نے اسے روک لیا۔

"یہی ہے....؟ اس نے پوچھا۔

"ہاں یہی ہے۔"

"تم بالکل ہی بے وقوف آدمی ہو رمضان۔ کیا صورت سے تمہیں یہ ہمارا آدمی معلوم ہوتا ہے؟" بابو نے کہا۔

"کسی دوسرے علاقے کا ہو سکتا ہے۔"

بکواس کر رہے ہو۔ کیا ہم اپنے آدمیوں کو نہیں پہچانتے اور پھر یہ ہمارا علاقہ ہے یہاں کوئی دوسرا دخل کیوں دے گا۔ تم کمیشن پہنچاتے رہو اور دھندہ جاری رکھو۔"

"تمہیں اطمینان ہے بابو جی؟"

"ہاں یار میں ضمانت دیتا ہوں تمہیں۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان کیا۔"

"دیکھیں۔ اس سالے نے گڑبڑ کی ہے۔ دروازہ بھی توڑ دیا۔

"تم اوپر چلو میں اسے دیکھتا ہوں۔"

"غریب دیہاتی ہے کوئی نقصان مت پہنچانا۔" بابو نے کہا اور واپس سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔ تب رمضان مجھے گھورنے لگا۔

"کیوں بے۔ لفڑا کر رہا تھا۔ رمضان کو نہیں جانتا۔"

"یہ پستول پھینک دو اور پھر مجھے بھی جان لو۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔ غیر جگہ تھی ورنہ میرے گاؤں کے لوگ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے لیکن رمضان کو میری بات بری نہیں لگی۔ اور وہ ہنس پڑا۔

"چل یاری کرلے۔ دھوکے میں مارا گیا سرا۔ بارش سے بچنے کے لئے یہی جگہ رہ گئی تھی۔ چل دوستی کرلیں۔"

"پہلے مجھے کھانا کھلاؤ۔ میں بھوکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آجا میرے لعل۔ بس آجا۔ آجا میرے پیچھے پیچھے۔" اس نے کہا۔ زمین پر پڑے ہوئے آدمیوں پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا اور وہ مجھے لئے ہوئے اوپر کے کمرے میں پہنچ گیا جہاں وہی عورت موجود تھی۔

"بابو چلے گئے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں.... مگر یہ....؟"

"نہیں، یہ ٹھیک ہے۔ بھوکا ہے جا جلدی سے کھانا لے آ۔" رمضان نے کہا اور وہ چلی گئی۔ اچھی خاصی شکل و صورت کی عورت تھی۔ عمر اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

"بیٹھ جا پٹولے۔ کہاں سے آیا ہے؟" رمضان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بتا چکا ہوں۔"

"کب آیا ہے میرے لعل؟"

"کل ہی آیا تھا۔"

"اور سیدھا قبرستان چلا آیا۔" رمضان کو موقع بے موقع ہنسنے کی عادت تھی۔

"یہ کراچی ہے؟" میں نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ تو رمضان کا گھر ہے معشوق۔ کراچی تو بہت بڑا ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"رات کو بارش ہو رہی تھی۔ میں نے ایک گھر کی چھت کے نیچے پناہ لی تو وہ مجھے چور سمجھے۔ پھر سوچا کہ قبرستان میں بارش سے بچوں تو...."

عورت کھانا لے آئی اور میں خاموش ہوگیا۔ بہرحال کھانا بہت اچھا تھا۔ ذرا سی دیر میں، میں نے برتن خالی کر دیئے۔ وہ دونوں آدمی بھی اچانک ہی کمرے میں پہنچ گئے تھے جنہیں میں نے ٹھیک کیا تھا۔

"مال بھر دیا حرامیو۔" رمضان غرایا۔

"ہاں دادا.... مگر یہ...."

"یار ہے اپنا۔ جاؤ مال لے جاؤ۔ مگر احتیاط سے۔ سب تمہارے باپ نہیں ہیں۔" رمضان نے کہا اور وہ دونوں چلے گئے۔ "ہاں تو پٹولے نوکری کرنے آیا ہے چک نمبر بارہ سے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا کام جانتا ہے؟"

"کوئی کام نہیں جانتا۔"

"پڑھا لکھا ہے کچھ؟"

"نہیں۔"

ٹھیک ہے پھر تو کوئی گورنمنٹ افسر ہی لگ سکتا ہے اور کوئی نوکری ملنا مشکل ہے۔" پھر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ "پیسے کمانا ہیں میری جان تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھو رمضان بھائی۔ میں پوری زندگی میں پہلی بار گھر سے باہر نکلا ہوں۔ کراچی میری سمجھ سے باہر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہاں کے لوگ کیسے ہیں کیا کرتے ہیں کوئی کسی کا عزیز رشتے دار یا دوست ہے کہ نہیں۔ یہاں میرے گاؤں کے کئی آدمی ہیں۔ ان میں گلو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ بہرحال یہاں آکر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گلو کی تلاش ناممکن ہے۔ ان حالات میں مجھے کسی کی ضرورت ہے تم نے غلط فہمی کی وجہ سے

میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے مجھے اس کی کوئی شکایت نہیں ہے لیکن اگر تم میری مدد کرو گے تو ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

"ہوں۔" رمضان نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔ "لیکن میری جان کراچی میں رہنا آسان بات نہیں ہے۔"

"میں اندازہ لگا چکا ہوں۔"

"اور کراچی میں رمضان جیسے آدمی کا ملنا بھی آسان بات نہیں ہے۔"

"میں۔ میں نہیں سمجھا؟"

"میرے ساتھ رہے گا تو سب کچھ بتاؤں گا۔ جانتا ہے میں کون ہوں۔"

"نہیں رمضان بھائی۔"

"دنیا کی نگاہوں میں ایک گورکن۔ جو قبریں کھودنے کا کام کرتا ہے لیکن مردوں سے زیادہ میں زندوں کو آسانی سے دفنا دیتا ہوں۔" رمضان نے خوفناک لہجے میں کہا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا رمضان بھائی۔"

مطلب یہ کہ پولیس میری مٹھی میں ہے۔ جس نے مجھ سے غداری کی میں نے اسے کبھی نہیں چھوڑا۔ میں جو کام تیرے حوالے کروں پوری ایمانداری سے انجام دینا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا رمضان بھائی۔"

"ہوشیاری بھی ضروری ہے۔"

"جو کام تم مجھے بتاؤ گے میں ہوشیاری سے کروں گا۔"

"تو پھر عیش بھی کرے گا۔ قسمت والا ہے کہ میرے پاس آگیا.... ورنہ نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرتا دو روٹی کے لئے۔" پھر وہ عورت کو آواز دے کر بولا۔ "چھیمے یہ میرا یار ہے۔ آج سے یہیں رہے گا۔ میں نے اسے دھندے میں شریک کر لیا ہے۔"

عورت مسکرائی اور اس نے گردن ہلادی۔ "اس کے لئے کوئی کمرہ ٹھیک کردوں؟"

"ہاں خیال رکھیو اس کا۔ اچھا سرورے اب تو آرام کر۔ کل سے کام تیرے حوالے کروں گا۔ میں ذرا جا رہا ہوں۔" میں نے متشکرانہ انداز میں گردن ہلادی اور رمضان چلا گیا۔ دل ہی دل میں' میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ تھوڑی تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اب ایک سہارا مل گیا۔ یہ سہارا میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔

عورت مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر نکل گئی اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں نے اس میں ہلکی سی تبدیلی محسوس کی تھی۔ اس کے

بکھرے ہوئے بال سلجھ کر بند گئے تھے اور ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔

"تمہارا نام سرور ہے نا....؟"

"ہاں۔"

"میرے ماموں کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام بھی سرور تھا۔"

"اچھا۔" میں نے احمقوں کی طرح گردن ہلادی۔

"بچپن ہی میں میری اس سے منگنی ہوگئی تھی۔"

"اچھا۔" میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔ مجھے شرم آ رہی تھی۔ دوسرے کی عورت تھی مگر کس بے تکلفی سے مجھ سے باتیں بنانے بیٹھ گئی تھی۔

"مگر پھر شادی نہیں ہوئی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی اور پھر ایک دم کہنے لگی۔ "چائے پیو گے؟"

پلادو۔" میں نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

"آؤ پہلے تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچا دوں۔" اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

میرے کمرے میں ایک پلنگ تھا جس پر دری بچھی ہوئی تھی۔ تین کرسیاں اور ایک میز پڑی ہوئی تھی۔

"غسل خانہ اس طرف ہے۔" اس نے باہر اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ پھر باہر نکل گئی اور میرے دل میں ایک عجیب سا احساس ہوا وہ کس بے تکلفی سے مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ گلو کے سنائے ہوئے بہت سے قصے مجھے یاد آ گئے۔ کراچی کی رومان پرور فضاؤں کی بہت سی کہانیاں گلو نے مجھے سنائی تھیں۔

لیکن دوسرے لمحے میں کانپ کر رہ گیا۔ چھیمے رمضان کی عورت ہے اور رمضان صورت ہی سے خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طرف تو پوری نظر بھی نہیں ڈالنا چاہئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میری لئے چائے بنا کر لے آئی اور خود بھی اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی۔

"اپنے گاؤں سے کب آئے تھے سرور؟"

"کل۔"

"اوہ۔ کراچی پہلی بار آئے ہو؟"

"ہاں۔"

"جب ہی اتنے شرمیلے ہو۔"

"کراچی کے لوگ شرمیلے نہیں ہوتے؟"

"کراچی کے لوگ۔" چھیمے نے ایک گہری سانس لی۔" چھوڑ کراچی والوں کی باتیں۔ تم اپنے گاؤں کی کہانی سناؤ۔"

"میرے گاؤں کی کیا کہانی ہو سکتی ہے؟"

"کہانی کہاں کی نہیں ہوتی۔ لاکھوں کہانیاں لاکھوں افسانے' گاؤں میں تمہارا کون کون ہے؟"

"ماں باپ ہیں اور دو بہنیں ہیں۔"

"بھائی کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"اور بیوی؟"

"نہیں۔" میں نے شرما کر جواب دیا۔

"ابھی عمر بھی نہیں ہے لیکن کوئی اور تو ہوگا۔"

"بس ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"کسی سے محبت بھی نہیں کی؟" اس نے شرارت سے کہا اور میرے کانوں کی لویں جل اٹھیں۔

"ایسی باتیں مت کرو چھیمے۔" میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"ارے تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں رمضان بھیا نے یہی کہہ کر پکارا تھا تمہیں۔"

"تم مجھے چھیمے مت کہو۔"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اب وہ باتیں کئے جا رہی تھی تو میں کیا کرتا۔

"مجھے اس نام سے نفرت ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"پھر تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"شاہدہ!"

"میں تمہیں بھابی کہوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں....؟"

"اس لئے کہ تم رمضان بھیا کی بیوی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بیوی۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کک۔ کیا مطلب....؟" میں اچھل پڑا۔

"تم اگر کوئی پولیس افسر بن جاؤ یا آبکاری کے انسپکٹر بن جاؤ یا کوئی بڑے آدمی بن جاؤ۔ ایسے کہ رمضان کو تم سے کوئی کام آن پڑے تو میں تمہاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔" اس نے کہا اور میرا حال برا ہو گیا۔ میں چائے پینا بھول گیا۔ حالانکہ عقل اجازت نہیں دے رہی تھی کہ اس سے ایسی باتیں کروں لیکن تجسس عقل پر حاوی ہو گیا تھا۔

"کک کیا مطلب؟" میں نے اسی طرح حیرت سے پوچھا۔

"مطلب آہستہ آہستہ سمجھ میں آ جائے گا۔"

"تم رمضان کی بیوی نہیں ہو؟"

"میں کسی کی بیوی نہیں ہوں۔ سب کی عورت ہوں۔"

"اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"گاؤں کے لوگ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ ابھی تمہیں کراچی کی ہوا نہیں لگی۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"نہیں تو۔" میں نے بے وقوفوں کی طرح گردن ہلادی۔ یہ عورت مجھے عجیب لگ رہی تھی۔ اس کی باتیں بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں۔

"اگر یہ بات ہے تو وعدہ کرو کہ جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہیں رمضان کو نہیں معلوم ہوں گی۔"

"رمضان کو کیسے معلوم ہو سکتی ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم تو نہیں بتاؤ گے؟"

"ارے نہیں۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

"وعدہ کرتے ہو۔"

"ہاں وعدہ کرتا ہوں"

"مجھے اطمینان ہے۔ اگر تم ایک سال بھی کراچی میں رہ جاتے تو اس کے بعد میں تم پر اعتبار نہ کرتی۔"

"ایک بات بتاؤ چھیمے۔ کراچی کیسی جگہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا مطلب؟"

"دیکھو۔ دنیا کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں۔ کراچی کے بارے میں تھوڑا بہت اس لئے جانتا ہوں کہ میرے گاؤں کے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں اور یہاں سے اپنے حالات بدل کر گئے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق تو کراچی نہ جانے کیا تھا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" چھیمے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے یہاں کے لوگ.... زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ جس وقت

میں یہاں آیا رات ہو چکی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے میں نے ایک ایسی جگہ پناہ لی جو کسی کے کام کی نہیں تھی، لیکن پہلے تو مجھے چور سمجھا گیا۔ پھر جب یہ بات پتہ چل گئی کہ میں چور نہیں ہوں تب بھی مجھے بارش ہی میں وہاں سے بھگا دیا گیا۔ اس کے بعد یہاں پناہ لی اور رمضان کے آدمیوں نے نہ جانے کیوں میری بڑی مرمت کی۔"

"ہاں، کراچی میں انسان بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی غیر انسانی زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ وہ مجبور ہیں۔"

"خیر چھوڑو۔ تم کیا بتا رہی تھیں۔"

"تم نے پوچھا تھا نا۔ میرا دل بھی چاہنے لگا کہ کسی کو اپنی کہانی سناؤں۔"

"بہت مختصر ہے۔ کراچی میں آئی۔ میری ماں اور سوتیلا باپ ساتھ تھا۔ ہمارا بھی ایک گاؤں تھا اور میرا منگیتر سرور وہاں رہتا تھا لیکن سوتیلے باپ کی برائیوں نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ وہ جواری اور شرابی تھا۔ مجھے اور میری ماں کو کراچی یہ کہہ کر لایا تھا کہ یہاں آ کر وہ محنت مزدوری کرے گا میری شادی کرے گا اور ہم لوگوں کو انسانوں کی زندگی دے گا لیکن جو خود انسان نہ ہو....."

چھیمی کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"اوہ پھر کیا ہوا....؟"

"اس نے رہنے کے لئے ایک کھولی تلاش کی اور کام کی تلاش میں نکل گیا۔ رات کو دارو پی کر وہاں آیا اور اس کے بعد اس کا یہی معمول بن گیا۔ ہم دونوں فاقے کرنے لگے۔ تب ایک شام وہ خوش واپس آیا اور اس نے خوشخبری سنائی کہ کام مل گیا۔ اور کام رات کو خود ہمارے گھر آ گیا۔ میرے باپ نے میری ماں کو "کام" کے حوالے کر دیا اور جب "کام" واپس گیا تو میری ماں کے نڈھال بدن کے پاس پچاس روپے رکھے ہوئے تھے۔

تب ہماری دوکان کھل گئی اور پچاس روپے روز کی آمدنی ہونے لگی۔ وہ میری ما کی ہر آواز بند کرنے پر قادر تھا۔ وہ ہر احتجاج کی گردن دبانے کی قوت رکھتا تھا۔ کھولی کی جگہ ایک مکان کرائے پر لے لیا گیا۔ کیونکہ اب پچاس روپے روز کی آمدنی تھی۔ پھر یہا جواء بھی کھیلا جانے لگا اور کسی جواری نے ہی اسے میری طرف متوجہ کیا۔ اس کے خیال میں، میں سو روپے روز کی چیز تھی۔

لیکن پچاس روپے کے نوٹ نے اس خیال سے سخت بغاوت کی اور میرے سامنے سینہ سپر ہو گیا نشے میں ڈوبے ہوئے میرے باپ نے ایک لمبے چاقو سے پچاس روپے کے نوٹ میں لاتعداد سوراخ کر دیے اور اس کے نتیجے میں گرفتار ہو گیا۔

قانون بنانے والے صرف یہ جانتے تھے کہ ایک مجرم نے قانون کے پیٹ میں چاقو اتار دیا ہے چنانچہ اس کو سزا دی جائے سو انہو نے سزا دے دی۔ میں تو صرف اس کہانی کا ایک ورق تھی جسے پڑھ کر چھوڑ دیا گیا۔ میرے بارے میں کسی نے غور نہیں کیا اور قاتل کو سزا دے کر سب پرسکون ہو گئے میرے باپ کو پھانسی دے دی گئی لیکن میری گردن میں لپٹی ہوئی رسی کی گرہ کسی نے تنگ نہیں کی۔

صرف ایک بڑا آدمی تھا اس پوری دنیا میں اور اس کا نام تھا رمضان۔ اس کے بھی میرے باپ سے تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ بھی جوئے کا شوقین تھا چنانچہ ازراہ ہمدردی وہ مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے خیال میں، میں بھاگوان ہو۔ جب سے یہا آئی ہو اس کا کاروبار خوب چل گیا ہے اور اب وہ صاحب حیثیت ہے اور اس کے بیان کے مطابق حیثیت بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کام کے لوگو کو خوش کرنا ہوتا ہے اور میں "خوش" کرنے کے کام آتی ہو۔ کیا سمجھے؟" وہ ہنس پڑی۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک سیدھا سادا آدمی ضرور تھا لیکن جذبات سے عاری تو نہیں تھا۔ چھیمی کتنی مظلوم تھی کتنے لوگوں کے ظلم و ستم کا شکار۔ میں اسے ہمدردانہ نگاہو سے دیکھتا رہا۔

"تمہارا نام سرور ہے۔ میرے منگیتر کا نام بھی سرور تھا۔ نہ جانے کتنے دن تک وہ مجھے یاد کرتا رہا ہوگا۔"

"اس کے بعد وہ تمہیں کبھی نہیں ملا؟" میں نے پوچھا۔

"خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔" وہ تڑپ کر بولی اور میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں؟"

"وہ نیک انسان تھا۔ فرشتوں کی طرح معصوم۔ خدا نہ کرے کہ وہ مجھ جیسی بری عورتوں سے ملے۔" اس لہجے میں بڑی محبت تھی۔ پھر وہ اٹھ گئی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔ کھانا وغیرہ پکانا ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ رمضان کے بارے میں میرے خیالات پہلے ہی اچھے نہیں تھے اب اور خراب ہو گئے لیکن بہرحال اس وقت ان باتوں پر غور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوپہر کو کھانے کے وقت رمضان موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور چھیمی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "چھیمی۔ لونڈا خوش ہے نا؟"

"میں کیا جانوں؟" وہ بولی اور رمضان نے ہاتھ روک لیا۔ "تو اور کون جانے گا؟"

رمضان غرایا اور چھیمے سہم گئی۔

"مم۔ میرا مطلب ہے۔ تم ان سے تو پوچھو۔"

"کیوں سرور۔ تو خوش ہے نا؟"

"بہت رمضان بھیا۔ تم بڑے نیک انسان ہو۔" میری اس بات پر رمضان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"نیک ہوگا تو خود۔ آئندہ یہ گالی کبھی مت دینا بیٹے یہ کراچی ہے یہاں نیک ہونا سب سے بڑی گالی ہے۔ جو نیک ہے وہ..... بھیک مانگتا ہے۔ دوسروں کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ لیاری کی جھونپڑیوں میں رہتا ہے۔ اس کے گھر کے تمام لوگ بیمار ہوتے ہیں اور ان کی دوا کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے سمجھا' وہ زندگی پر بوجھ ہوتے ہیں اور زندگی ان پر بوجھ ہوتی ہے۔ پھر تو مجھے یہ گالی کیوں دے رہا ہے؟"

میں تعجب سے رمضان کی شکل دیکھنے لگا۔

"چھوڑ کھانا کھا۔ تھوڑے دن کے بعد سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کل سے کام شروع کرنا ہے تجھے۔"

"ٹھیک ہے رمضان بھیا۔" میں نے جواب دیا اور خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے دن رمضان نے مجھے ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دیا جس کا نام مجید تھا۔

"مجید۔ اسے سیکٹر نمبر چار کے اڈے دکھادے۔ سیکٹر چار کی سپلائی کل سے یہ کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مجید نے کہا اور میں مجید کے ساتھ باہر نکل آیا۔ مجید کافی ہنس مکھ آدمی تھا۔ وہ مجھے راستوں کے بارے میں بتاتا گیا۔ بسوں میں سفر کیا اور گھر سے باہر کی کراچی مجھے واقعی پسند آئی۔ یہاں زندگی کے لئے بیشمار دلچسپیاں تھیں۔ مجید میرے سوالات پر دل کھول کر ہنس رہا تھا۔

"یہاں تو ہر جگہ میلہ لگا رہتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو گھروں میں کوئی کام نہیں ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"کام تو گھروں سے باہر ہوتے ہیں یار۔" مجید نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں تو میلوں میں اتنی رونق نہیں ہوتی تھی۔"

"تمہارے ہاں کی کیا بات ہے۔"

میں مجید کے سمجھائے ہوئے راستے اچھی طرح ذہن نشین کر رہا تھا۔ میں بہرحال

ہوشیار تھا اس لئے مجھے کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔

بلڈنگوں اور ہنگاموں کے اس شہر کی رنگینیاں اب میرے علم میں آ رہی تھیں اور ان سے واقف ہونے کے بعد کراچی مجھے برا نہیں لگا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہم واپس آ گئے۔

"کیوں پٹولے' کیسی لگی کراچی؟"

"اچھی ہے رمضان بھیا۔"

"اب تو نے کام سیکھ لیا ہے۔ بھیادیا کا رشتہ ختم۔ اب تو مجھے دادا کہا کر۔"

"دادا" میں ہنس پڑا۔ "مگر تم تو میرے باپ سے بھی چھوٹے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"دادا کہاں سے ہو گئے۔"

"الو ہے سالے۔ دادا بدمعاش کو کہتے ہیں۔"

"مگر تم تو بڑے نیک آدمی ہو رمضان بھیا۔ تم نے میری مدد کی ہے ورنہ یہاں تو میں بے سہارا تھا۔"

"اب' فضول کی بحث کئے جائے گا۔ بس جو کہا گیا ہے وہی ٹھیک ہے اور اس خیال کو دل سے نکال دینا کہ میں نیک آدمی ہوں دوسری بار تو نے مجھے نیک کہا ہے تیسری بار تیرے منہ سے یہ لفظ نہ نکلے۔"

"ٹھیک ہے میرے باپ کے باپ۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا اور رمضان ہنس پڑا۔

"راستے یاد ہو گئے ہیں تجھے؟"

"ہاں' جو مجید نے بتائے ہیں وہ تو یاد ہو گئے۔"

"بس ٹھیک ہے آرام کر۔" رمضان نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ ویسے میں خوش تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھی اب ضرور بڑا آدمی بن جاؤں گا اور نہ جانے میری آنکھوں میں کتنے خواب لہرانے لگے۔ ان خوابوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ چھیمے آ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تھک گئے ہو سرور؟" اس نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ارے نہیں تھکنے کا کیا کام اور پھر چلنا تو بالکل نہیں پڑا۔ جبکہ اپنی بستی میں' میں بیس بیس کوس پیدل چل لیتا تھا۔"

"پاؤں دبادوں؟" چھیمے نے میرے پائنتی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہیں۔" میں اچھل پڑا۔ "میں نے کہا کبھی پاؤں نے دبوائے۔"

"آج دبوالو" وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"کک۔ کیوں؟"

"بس میرا دل چاہ رہا ہے۔"

"ایمان سے جھیپے۔ میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم رہنے دو ایسے ہی بیٹھو۔"

"بس مجھے تمہارے نام سے محبت ہو گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی یادوں کو ایسے ہی جوڑنے میں لطف آجاتا ہے۔"

"شاید تم اپنے منگیتر کی بات کر رہی ہو۔"

"ہاں۔"

تم دوبارہ اپنی بستی میں چلی جائیں جھیپے۔"

"اس وقت اس قابل نہیں تھی اور جس وقت اس قابل ہوئی تو بستی میرے لئے بہت متبرک تھی اور میں اسے گندہ نہیں کر سکتی تھی۔"

"اوہ۔" میں نے گردن ہلائی اور خاموش ہو گیا۔ اس عورت کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا تھا لیکن میں کیا اور میری بساط کیا۔ دیر تک خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔ "رمضان کیا کر رہا ہے؟"

"سو رہا ہے۔ ویسے اب اسے میری فکر نہیں رہتی۔ شروع کے کچھ دنوں میں اس کے لئے دلکش رہی۔ اب تو صرف ایک ضرورت ہوں۔"

"وہ تم سے کچھ نہیں کہتا؟"

"وہ اب معمولی آدمی نہیں ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے۔ شہر میں اس کے کئی مکان ہیں' چاکیواڑہ میں ایک ہوٹل ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ شہر میں اس کی کئی عورتیں رہتی ہیں جن سے وہ دل بہلاتا ہے اور ان کا خرچ اٹھاتا ہے۔"

"اوہ۔ پھر وہ یہاں کیوں رہتا ہے۔"

"یہاں۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ "یہاں کام جو ہوتا ہے۔"

"کون سا کام؟"

"یہ مجھ سے مت پوچھو اس کے لئے کام کرتے رہے تو خود ہی سب جان جاؤ گے۔"

اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا اور میں بھی خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن سے میں نے کام شروع کر دیا کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔ پہلے میں ایک خاص قسم کا تھیلا لے کر ایک دوکان پر گیا جہاں وہ شخص موجود تھا جس سے پہلے دن میری ملاقات کرائی گئی تھی۔ اس نے مجھ سے سلام دعا کی اور پھر اندر لے گیا۔ پھر تھیلا میں نے اس کے سپرد کر دیا اور اس نے مجھے تین سو روپے دیئے۔ پھر بولا۔

"کل کے لئے چھ کا آرڈر ہے۔ دادا کو بتا دینا۔" میں نے گردن ہلائی اور واپس قبرستان آگیا۔ رمضان موجود تھا۔ میں نے پیسے اسے دیئے اور دوکاندار کی بات دہرائی۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ اب تم بڑی کریٹ لے جاؤ اور تین دوکانوں پر گھوم آؤ۔ جو جتنا مال لے' دے آنا اور پیسے نقد۔ اگر کوئی سالا ادھار کرے تو منع کر دینا۔"

"مگر مجھے قیمت کیسے معلوم ہوگی دادا۔"

"ایک بوتل تیس روپے کی۔ بس یہ حساب ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تو اس میں بوتلیں ہوتی ہیں۔"

"ابے ہاں گھامڑ کہیں کا۔ بس اب جلدی کر سکیٹر نمبر چار پورا کرنا ہے مگر ہوشیاری سے بڑوں کی نگاہوں سے بچ کے۔"

"ٹھیک ہے دادا۔" میں نے گردن ہلا دی اور دوبارہ نکل گیا۔ راستے میں میں نے ان بوتلوں کو دیکھا جن میں رنگین پانی بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا چکر تھا۔ بہرحال میں نے دادا کی ہدایت کے مطابق بوتلیں سپلائی کر دیں اور رقم وصول کرکے واپس آگیا۔ شام کو چار بجے تک میں نے اپنا کام مکمل کر لیا اور تقریباً ایک ہزار روپے وصول کرکے دادا کو دے دیئے۔

آخری بار جب میں نے دادا کو پیسے دیئے تو وہ مسکرایا جانتا ہے آج تو نے کیا کمایا۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔ "ہزار روپے کا مال بیچا ہے تو نے تین پرسنٹ تیرا۔ یعنی تیس روپے۔ جتنا کام بڑھائے گا اتنا ہی زیادہ کمائے گا۔ کیسا دھندہ ہے؟" اس نے دس دس کے تین نوٹ میری طرف بڑھا دیئے۔

اور میرا دل دھک سے ہوگیا۔ ایک دن کی کمائی تیس روپے جبکہ میرے باپ کو چوہدری صاحب کے ہاں کام کرنے کی تنخواہ ایک مہینے میں پچاس روپے ملتی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے نوٹ لے لئے۔

"مگر دادا....؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کم لگ رہے ہیں۔ دوسرے کو پانچ پرسنٹ دیتا ہوں مگر تو نے آج کام شروع کیا ہے بعد میں بڑھا دوں گا۔"

"یہ بات نہیں دادا۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"یہ پیسے رہنے دو۔ میں یہاں رہ رہا ہوں۔ کھا رہا ہوں اتنے سے کام کے پیسے لیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

"بنا سالا نیک۔ ابے میں نے کہہ دیا ہے یہاں آیا ہے تو آدمی بن آدمی۔ نیک بن

کر کچھ نہیں ملے گا۔ کھانا اور رہائش مفت ہے تیری۔ دیکھتا جا تجھے کیا سے کیا بنا دیتا ہوں۔ رکھ لے پیسے اور عیش کر۔ کراچی بڑے عیش کی جگہ ہے۔" رمضان نے قہقہہ لگا کر میرے شانے پر ہاتھ مارا اور میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پیسے جیب میں رکھ لئے۔

اس شخص کے بارے میں' میں دوہرے خیالات میں الجھ گیا تھا۔ میرے جس طرح کام آیا تھا اس کی وجہ سے میں اس کا ممنون تھا لیکن چھیمے نے جو کچھ سنایا تھا اس کے مطابق وہ بے حد خراب آدمی تھا۔

بہرحال دوسرے دن سے میں نے نہایت تیزی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ آج رمضان نے مجھے ہدایات بھی نہیں دی تھیں اور میں نے خود کام کیا تھا۔ رمضان گیارہ بجے کے قریب چلا گیا تھا۔

شام کو جب وہ واپس آیا تو میں نے سولہ سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اس نے اڑتالیس روپے مجھے دے دیئے۔ دو ہی دن میں میرے پاس بہتر روپے جمع ہو گئے تھے۔ کھانے وغیرہ میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا تھا۔ دوسرا کوئی خرچ نہیں تھا۔ میں پوری لگن سے کام کرنے لگا۔ ابھی تک میں نے کراچی کا ایک مخصوص علاقہ دیکھا تھا۔ رمضان کے لئے بہت سے لوگ کام کرتے تھے لیکن میں ابھی سیکٹر نمبر چار ہی میں تھا۔ البتہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس علاقے میں مال کی سپلائی بڑھ گئی تھی اور صرف ایک ہفتے میں میری جیب میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے تھے۔

میں نے یہ پیسے چھیمے کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ اس دن جب میں نے پیسے چھیمے کو دیئے تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "یہ پیسے کیوں جمع کر رہے ہو سرور علی؟"

"بس چھیمے۔ پانچ سو روپے پورے ہو جائیں گے تو گھر بھجوا دوں گا تم نہیں جانتیں۔ میرے ماں باپ کو پیسے کی کتنی ضرورت ہے۔ میری بہنیں جوان ہو گئی ہیں ان کی شادی کی فکر کرنا ہے مجھے۔"

"اچھا۔ بڑا نیک ارادہ ہے۔ تم یہ پیسے کب بھجواؤ گے سرور؟"

"دو دن کے بعد سو روپے اور جمع ہو جائیں گے چھیمے۔ تیسرے دن ڈاک خانے چلا جاؤں گا۔"

"تھوڑا سا نیک کام مجھے کرنے دو گے سرور۔"

"کیا مطلب؟"

"میری طرف سے ان پیسوں میں تھوڑا سا اضافہ کر لینا۔"

"ارے! نہیں چھیمے تمہارا شکریہ۔ اتنے احسانات نہ کرو میرے اوپر کہ میں ان کے

بوجھ تلے دب جاؤں۔"

"تمہاری مرضی سرور۔ میں تو تمہارے اپنوں میں شامل ہونا چاہ رہی تھی۔ اس دنیا میں میرا ہے ہی کون تم بھی مجھے یہ حیثیت نہیں دو گے تو کوئی خاص بات تو نہیں ہوگی۔"

"خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے چھیمے۔"

"تو پھر تھوڑی سی خوشی مجھے بھی دے دو۔" اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہاری مرضی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بس تو جب تم پیسے جمع کرنے جاؤ تو مجھے بتا دینا۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ دو دن کے بعد پورے پانچ سو تیس روپے ہو گئے۔ میرے دل و دماغ کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ گاؤں سے آئے ہوئے مجھے ابھی چودہ دن ہوئے تھے اور ان چودہ دنوں میں' میں پانچسو روپے روانہ کر رہا تھا۔ ایک ایسی ناقابل یقین بات تھی جس پر خود مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب میں جانے لگا اور چھیمے نے کچھ مجھے دیا اسے دیکھ کر تو میرے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ چھیمے نے مجھے پورے ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے۔

"یہ ہو گئے پورے تین ہزار۔ بس اب تم جلدی بھاگ جاؤ اور منی آرڈر کی رسید لا کر مجھے دکھاؤ۔"

"چھیمے۔ یہ۔ یہ۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھو وعدہ کر چکے ہو سرور۔" چھیمے عجیب سے لہجے میں بولی۔

"بہت بڑی رقم ہے چھیمے۔"

"میرے پاس بھی بے کار پڑے ہوئے ہیں سرور رمضان کو کسی وقت ضرورت پڑی تو لے جائے گا اور جو رقم وہ لیتا ہے کبھی واپس نہیں کرتا۔ اس طرح کسی کے کام آ جائے گی۔ بس اب جاؤ۔" اور میں یہ گرانقدر رقم لے کر پوسٹ آفس چل پڑا۔

تین ہزار روپے کا منی آرڈر۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نہ جانے میرے والدین پر کیا رد عمل ہو۔ بہرحال میں نے پیسے منی آرڈر کرائے اور پھر باہر بیٹھے ہوئے شخص سے ایک خط بھی لکھوایا۔ میں نے لکھوایا تھا

پیارے ابا جی

"السلام علیکم"

آپ لوگوں سے رخصت ہو کر میں خیریت کے ساتھ کراچی پہنچ گیا۔ میری خوش قسمتی اور آپ کی دعاؤں سے مجھے نوکری فوراً ہی مل گئی۔ بہت اچھی آمدنی ہے۔ میں تین ہزار روپے بھیج رہا ہوں آپ زمیندار صاحب کے پیسے واپس کر دیں اور باقی پیسوں سے آپ کا جو دل چاہے کریں۔

میں بہت جلد آپ کو اور پیسے بھیجوں گا۔ آپ بھی میرے لئے دعا کریں اور ہاں اپنا پتہ بعد میں آپ کو لکھوں گا۔

زمیندار صاحب کو میرا بہت بہت سلام کہہ دیں۔ اماں کو بھی سلام اور دونوں بہنوں کو بھی پیار کہہ دیں۔

آپ کا تابعدار۔ سرور علی

خط ڈالتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں آنسو پونچھتا ہوا نکل آیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں قبرستان پہنچ گیا۔ رمضان موجود نہیں تھا چھیمے نے رسید دیکھی اور پوچھا۔

"کوئی خط بھی لکھا؟"

ہاں۔ خیریت کا خط ڈال دیا ہے۔"

"تمہارا پتہ کیا ہے؟ مجھے لکھوا دو۔"

"تم کو لکھنا آتا ہے چھیمے؟"

"میں اردو لکھ پڑھ لیتی ہوں۔ بعد میں سیکھ لی تھی۔"

"تب تو میرے خط تم ہی لکھ دیا کرو۔ مجھے تو یہاں کا پتہ بھی نہیں معلوم تھا ورنہ خط میں لکھ دیتا۔ آئندہ خط تم لکھ دینا اور اس میں پتہ بھی لکھ دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" چھیمے نے کہا۔ پھر بولی۔ "میرا تو خیال ہے کہ تم بھی تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔"

"بڑا دل چاہتا ہے چھیمے مگر...."

"کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تھوڑا بہت تو میں ہی سکھا دوں گی۔ کل جب بازار جاؤ تو جو میں لکھوں خرید کر لے آنا۔"

"چھیمے۔ ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو...."

"یہ رمضان دادا میرے ہاتھ کیا چیز بھیجتے ہیں۔ مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا۔"

"تم نے خود کبھی نہیں سوچا۔"

"لو میں کیا سوچتا؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"تھوڑے دن اور صبر کرلو سرور خود سمجھ جاؤ گے۔"

"تم اپنی زبان سے نہیں بتاؤ گی۔ چلو کوئی حرج نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو معلوم ہو ہی جائے گا۔" میں نے ہنس کر کہا اور چھیمے خاموش ہو گئی۔

لیکن سارے ہی راز منکشف ہوتے جا رہے تھے۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی تو میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ باہر خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تاریکی میں ڈوبا ہوا قبرستان عجیب لگ رہا تھا۔ معاً مجھے ایک درخت کے نیچے روشنی نظر آئی اور میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ درخت کے نیچے ایک بڑی سی سفید قبر تھی۔ ممکن ہے اس قبر پر کسی نے چراغ جلایا ہو لیکن روشنی ایک لمحے کے لئے ہوئی تھی اور پھر بجھ گئی تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ پھر روشنی سے ایک ہیولا برآمد ہوا اور باہر نکل آیا۔ روشنی پھر معدوم ہو گئی۔

ایک لمحے کے لئے میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں سینکڑوں خیالات میرے ذہن میں آئے اور میں قرآنی آیات پڑھنے لگا لیکن پھر اور کچھ ہوا۔ جو ہیولا وہاں سے برآمد ہوا تھا اس نے ماچس جلائی اور پھر سگریٹ سلگا کر اس کے کش لینے لگا۔

پاک ارواح سگریٹ تو نہیں پیتیں۔ میں نے سوچا اور دیر تک سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے کو متحرک دیکھتا رہا۔ جو کوئی بھی تھا۔ درخت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر اس نے سگریٹ پھینک دیا ایک بار پھر روشنی ہوئی اور ہیولا قبر میں گھس گیا۔

دیر تک میں کشمکش میں رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ قریب جا کر دیکھوں ہلکا سا خوف بھی تھا لیکن تجسس خوف پر غالب آ گیا اور میں آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ قبر کے رخنوں سے روشنی ابھر رہی تھی۔

بڑی انوکھی قبر تھی.... ہمت کر کے میں نے اسے ٹٹولا ایک کنڈا سا لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر کھینچا تو قبر کا ڈھکن اتنی آسانی سے اٹھ گیا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پتھر اور سیمنٹ کے بجائے کسی اور ہلکی چیز کا بنا ہوا تھا۔ میں ایک دم روشنی سے نہا گیا لیکن نیچے لوہے کی ایک سیڑھی دیکھ کر میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ اب اس پورے راز کو معلوم کئے بغیر واپس جانا میرے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ میں قبر میں اتر گیا۔ سیڑھی نیچے تک گئی تھی اور اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اسے دیکھ کر میری سانس رکنے لگی۔

بہت بڑا کمرہ تھا جس میں عجیب عجیب چیزیں لگی ہوئی تھیں آٹھ دس آدمی وہاں کام کر رہے تھے۔ آگ جل رہی تھی دھواں اٹھ رہا تھا لیکن رمضان دادا وہاں موجود تھا۔ پھر کسی نے مجھے دیکھ لیا اور اچانک سارا کام رک گیا۔ رمضان دادا سانپ کی طرح پلٹا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں خون نظر آیا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا لیکن پھر وہ کسی قدر جھنجلا گیا اور میرے نزدیک پہنچ گیا۔

"تم۔ یہاں کیسے آئے؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔ وہ بس میں۔ میں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"وہ حرامزادی بھی تمہیں نہیں سلا سکی؟"

"غلطی ہو گئی دادا۔ باہر نکل آیا تھا۔ قبرستان میں ایک دم روشنی نظر آئی اور میں یہاں چلا آیا مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

"کون ہے یہ دادا؟" کسی نے پوچھا۔

"الو کا پٹھا ہے۔ یہیں رہتا ہے۔"

"مگر یہ تو اچھا نہیں ہوا دادا۔ غلط آدمی نہ ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ میں جانتا ہوں اسے۔ بے وقوف نہ ہوتا تو اندر کس طرح آ جاتا۔" رمضان نے کہا۔

"مگر دادا۔ اب تو یہ سالا...."

"ٹھیک ہے تم لوگ اپنا کام کرو۔ اور تم.... میرے ساتھ آؤ۔"

دادا نے مجھ سے کہا اور میں اس کے پیچھے واپس باہر نکل آیا۔ تم نے جو حرکت کی ہے اس کے بدلے تمہاری گردن بھی کاٹی جا سکتی ہے۔"

"مگر میں نے تو دادا....؟"

"زندہ رہنا چاہتے ہو یا ٹھنڈا کردوں۔" دادا غرایا۔

"غلطی ہو گئی۔ آئندہ اس طرف کبھی نہیں آؤں گا مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا اور دادا کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا تیرے ساتھ کیا کروں۔ سن' آئندہ صرف اپنے کام سے کام رکھ جتنا تجھے بتایا جائے ورنہ ان قبروں میں خاموشی سے ایک قبر تیری بھی بن جائے گی حرامزادے۔ پہلی اور آخری بار معاف کر رہا ہوں ورنہ....!"

"ٹھیک ہے دادا۔" میں نے جواب دیا۔ حالانکہ جس طرح اس نے مجھے گالیاں دی تھیں تو یہی دل چاہا تھا کہ اس کی گردن دبادوں لیکن نتیجہ....

میں وہاں سے چلا آیا لیکن وہ عجیب و غریب قبر بری طرح میرے ذہن سے چپک گئی تھی۔ قبریں اسی طرح خالی تو نہیں ہوتیں۔ اس چھوٹی قبر کے نیچے کیا ہو رہا تھا۔ نہ جانے کب تک میں اس خیال میں ڈوبا رہا تھا۔ پھر نیند آگئی۔



دوسرے دن رمضان کا مزاج بہت خراب تھا۔ صبح کو اس نے ناشتے پر مجھے بلایا اور سخت نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "رات کو تو نے جو حرکت کی ہے سرور۔ اس کے نتیجے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ میں تیری زبان کاٹ دوں۔ ہاتھ توڑ دوں اور آنکھیں پھوڑ کر کسی چوراہے پر بھیک مانگنے بٹھا دوں لیکن سالے نہ جانے کیوں تیرے اوپر رحم آ جاتا ہے۔"

"میں معافی مانگ چکا ہوں دادا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میرا یہاں آنا پسند نہ کرو گے اور یہ بات میرے علم میں ہوتی کہ وہ کوئی ایسی جگہ ہے تو کبھی وہاں نہ جاتا۔"

"میرے سارے آدمی بگڑ رہے ہیں۔ وہ سب تجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔"

"مگر یہاں ایسی کیا خاص بات ہے دادا؟"

"ہے یا نہیں ہے لیکن ایک بات تو اچھی طرح جان لے۔ اگر کبھی تیری زبان سے کسی کے سامنے کچھ نکل گیا تو پھر تجھے بچانا میرے بس سے بھی باہر ہوگا۔ ویسے بھی سالا افسر تبدیل ہوگیا ہے۔"

"کون سا افسر رمضان؟" میرے بجائے چھیمے بول پڑی۔

"وہی اپنا یار۔ جو آڑے وقت میں کام آتا تھا۔ اب نیا افسر آیا ہے اسے ہٹانے میں بھی وقت لگے گا۔"

"اوہ۔ وہ کہاں گیا؟" چھیمے نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں گیا اب کیا میں ڈیوٹی انچارج لگا ہوا ہوں؟" رمضان پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا..... چھیمے خاموش ہوگئی۔

"تو نے سن لیا کان کھول کر۔" رمضان پھر مجھ سے بولا۔

"اب کتنی بار کہوں دادا۔ مان بھی جاؤ۔ میں تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے بھی کسی قدر منہ بنا کر کہا اور دادا خاموش ہوگیا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے حسب دستور اپنا کام جاری رکھا دوسرے ہفتے میں بھی

میرے پاس تقریباً چھ سو روپے جمع ہو گئے رمضان حساب کتاب کا ٹھیک آدمی تھا۔ شروع شروع میں مجھ سے ناراض رہا لیکن پھر ٹھیک ہوگیا۔

میری تقدیر سے کام میں کچھ ترقی ہی ہوگئی تھی۔ چنانچہ دادا نے میرا کمیشن بھی بڑھا دیا۔ اس سے اچھا کام مجھے زندگی بھر نہیں مل سکتا تھا۔ ایک دن دادا بہت خوش تھا۔ کسی قدر نشے میں بھی تھا۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"کراچی دیکھا؟"

"بس اتنا ہی دیکھا ہے دادا جتنا تم نے دکھایا ہے۔"

"تو گھر میں کیوں گھسا رہتا ہے۔ باہر نکل سالا کنجوس کہیں کا۔ بس چھیمے ہی کے کلیجے سے لگا رہتا ہے۔ اے باہر اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"کس کے ساتھ جاؤں دادا۔"

"آں ہاں۔ نخرے تو سالے لونڈیوں کی طرح کرتا ہے۔ ابے کپڑے بنا۔ عیش کر پیسے جمع کرنے کے لئے عمر پڑی ہے۔ گانا سننے چلے گا؟"

"لے چلو گے تو ضرور چلوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"شام کو تیار رہیو۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی چھیمے بھی اس گفتگو کے دوران موجود تھی۔ جب دادا چلا گیا تو اس نے پوچھا۔

"جاؤ گے رمضان کے ساتھ؟"

"ہاں کراچی دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے کسی کا ساتھ ضروری ہے۔ کیوں تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟"

"وہاں سے واپس آؤ گے تو پوچھوں گی۔" چھیمے نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا' شام کو میں نے اپنے صاف کپڑے پہنے اور رمضان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ رمضان نے بھی رنگین کرتا شلوار پہنا تھا۔ مونچھوں پر تاؤ دیا تھا اور پوری طرح تیار ہو چکا تا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

قبرستان سے کافی فاصلے پر ایک سڑک تھی.... اس سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی نزدیک آ کر رک گئی۔

"نیپئر روڈ۔" رمضان ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا اور مجھے بھی نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ ٹیکسی چل پڑی تھی اور میرے کام کے سلسلے میں مجھے جتنا علاقہ سونپا گیا تھا۔ اس کے بعد آج پہلی بار میں کراچی کے کچھ دوسرے حصے دیکھ رہا تھا۔ ٹیکسی کا سفر خاصا طویل تھا اور پھر وہ ایک ایسے بازار میں آ کر رک گئی جہاں بہت رش تھا۔ چاروں طرف سے گاڑیاں گھوڑا گاڑیاں' ٹرک' بسیں آ جا رہی تھیں۔ یہ سڑکیں کراچی کی دوسری سڑکوں کی بہ نسبت کچھ کم چوڑی تھیں اور یہاں ضرورت سے زیادہ ہی گھماگھمی تھی۔ رمضان میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور پھر وہ ایک عجیب سے علاقے میں پہنچ گیا۔ گانے بجانے کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ چھوٹے دروازوں پر پڑی ہوئی چقوں کے پیچھے رنگین چہرے نجانے کسے اشارے کر رہے تھے' رمضان مسکراتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ ایک زینے کے پاس رک گیا۔

"آجا پٹولے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر گھسیٹتے ہوئے کہا اور میں اس کے ساتھ

اوپر چلا گیا۔

عجیب سی جگہ تھی' چار دروازے تھے جن کے سامنے جوتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دروازے سے رمضان اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بڑی عجیب سی نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھا' کئی تماش بین بیٹھے ہوئے تھے اور ایک رقاصہ ان کے درمیان رقص کر رہی تھی' سازندے ساز بجا رہے تھے' کچھ اور رقاصائیں بیٹھی ہوئی تھیں اور گانا ہو رہا تھا نجانے کیوں مجھے یہ ماحول ضرورت سے زیادہ بے باک محسوس ہوا' چوہدری فضل الٰہی کے بیٹے کی شادی میں بھی گانے بجانے کا پروگرام ہوا تھا لیکن وہاں میں نے یہ ساری باتیں محسوس نہیں کی تھیں' یہاں کا ماحول تو کچھ ضرورت سے زیادہ بے باک تھا' میں ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

"بڑے دنوں کے بعد آئے ہو رمضان دادا۔" ایک عورت جو خاصی عمر رسیدہ تھی رمضان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"فرصت ہی کہاں ملتی ہے' بس تیری یاد کھینچ لائی' چلے آئے۔" رمضان نے جواب دیا۔

"یہ کون ہے؟"

"پٹولا ہے' پٹولا۔" رمضان پیار سے میری جانب دیکھ کر مسکرایا۔

"خوب جب تمہارا پٹولا ہے تو ہمارا بھی ہے۔" عورت نے مسکرا کر میرا رخسار نوچ لیا اور میں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا' میرا دل اس ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا لیکن مجھ میں اٹھ کر بھاگنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ رمضان نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر باہر رکھ لی اور ان نوٹوں میں سے ایک نوٹ پھاڑ کر رقاصہ کی جانب اشارہ کیا اور رقاصہ اس کے سامنے پہنچ گئی۔ گانے کے وہ بول جو وہ دہرا رہی تھی۔ ہمارے سامنے دوہرانے لگی لیکن اس کا انداز بڑا ہی عجیب اور بے حجاب تھا' میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ صحیح معنوں میں یہ جگہ بیٹھنے کے قابل نہیں ہے' چھیمے ٹھیک ہی کہتی تھی۔

ایک کے بعد ایک گانا ہوتا رہا' رقاصہ ادائیں لٹاتی رہی تماش بین اس پر نوٹوں کی بارش کرتے رہے' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان ساری باتوں سے کیا حظ اٹھایا جا رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ دولت ضائع کی جائے۔ رمضان نے جتنی دولت اس رقاصہ کو دے دی تھی' میرا خیال ہے اتنی دولت تو بہت سے لوگوں کی زندگیاں بنا سکتی تھی' چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر رمضان کبھی دوبارہ اس طرف آئے گا تو میں اس سے صاف انکار کر دوں گا۔ بہرصورت نجانے رات کا کیا بج گیا۔ رمضان نے میری طرف



دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"پسند آئی ہے کوئی....؟"

"کک۔ کیا....؟" میں نے احمقانہ انداز میں منہ کھول دیا۔

"جو پسند آئی ہے اس پر ہاتھ رکھ دے' اٹھا کر لے چلیں گے۔" رمضان نے کہا اور میں چونک گیا۔

"مم۔ مگر کیا چیز دادا۔" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا اور رمضان کا زوردار قہقہہ گونج اٹھا۔

"ابے سالے' رہا نہ گھامڑ کا گھامڑ' ابے ان میں سے کوئی لونڈیا تجھے پسند نہیں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں' دادا واپس چلو۔"

"ہوں۔ سالے چھمیا کا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔" رمضان نے طنزیہ انداز میں کہا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ ٹیکسی جب قبرستان کی طرف دوڑ رہی تھی' تب میں نے رمضان دادا سے کہا۔

"دادا ابھی تم نے ایک بات کہی تھی۔"

"کیا....؟" اس نے ترنگ میں پوچھا۔

"تم نے کہا تھا دادا کہ میں چھمیا کا ہی ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"ہاں ہاں تو اور کیا۔ ابے دنیا تو بڑی وسیع ہے اور پھر چھمیا ہی میں کیا رکھا ہے' ابھی باہر نکل' دیکھ تماشے دنیا میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔" رمضان نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"لیکن دادا میں تمہیں ایک بات بتادوں۔" میں نے کسی قدر اعتماد سے کہا رمضان مجھے دیکھنے لگا۔

"بتا بتا' کیا بتانا چاہتا ہے؟"

"میں نے چھمیے کو ہمیشہ تمہاری عورت سمجھا ہے اور دادا میرے ضمیر نے کبھی اس بات کو قبول نہیں کیا کہ میں تمہاری عورت پر بری نگاہ ڈالوں۔ اگر کبھی یہ بات ثابت ہو جائے کہ میں چھمیے سے کوئی بدسلوکی کی ہے تو خدا کی قسم اپنی آنکھیں ہاتھ سے نکال کر تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔"

"ابے...." دادا نے حیرت سے مجھے دیکھا۔" ابے گدھے یہ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ چھمیے میری عورت ہے۔" رمضان دادا نے کہا۔

"کہا ہو' یا نہ کہا ہو۔ میں نے اسے تمہارے ساتھ دیکھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ تمہارا اس سے کوئی تعلق ہے' دادا پہلے تو میں اسے تمہاری بیوی ہی سمجھتا تھا اور جب میں نے اسے تمہاری بیوی سمجھ لیا تو پھر اسکی طرف غلط نگاہوں سے دیکھنے کا کیا سوال۔"

"دمت تیرے کی۔ ابے دادا کی بتیس بیویاں ہیں مگر ایک بھی نہیں ہے اور سن اگر میرے دل میں اتر گیا تو بتیس کی بتیس تیری۔ ویسے تو نے اچھے جذبے کا اظہار کیا ہے۔ میں اس سے خوش ہوا ہوں۔" رمضان دادا نے کہا۔

"ٹیکسی قبرستان میں رک گئی اور رمضان بل ادا کرکے میرے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ چھمیے جاگ رہی تھی۔

"کھانا لے آؤں؟" اس نے پوچھا۔

"میں نہیں کھاؤں گا۔ اسے کھلا اور سن۔" دادا نے کہا اور چھمیے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ جوان پسند نہیں آیا تجھے؟"

"کیوں....؟" چھمیے نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ دادا نے ہنستے ہوئے کہا اور چھمیے نے گردن ہلا دی' میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دادا باہر نکل گیا تھا اور چھمیے شاید باورچی خانے کی طرف۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کھانا لے آئی۔ ضرورت سے زیادہ خاموش تھی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"کھانا کھالو۔"

"تم نے کھالیا چھمیے؟"

"ہاں۔"

"میرے ساتھ تھوڑا سا کھالو۔"

"نہیں۔ میں کھا چکی ہوں۔"

"پھر میں بھی نہیں کھاتا۔" میں نے کہا اور اس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"لے جاؤں اٹھا کر....؟"

"ہاں۔" اور جھمیے نے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہے لیکن اس میں میرا کیا قصور لیکن تھوڑی دیر کے بعد جھمیے واپس آگئی۔ اس نے میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر میری طرف مڑی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

لیکن دوسرے لمحے اس نے جو کچھ کیا اس سے میری حالت غیر ہوگئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا اور میرا لباس اتار دیا تھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور پھر.... اور پھر۔ میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ ان بند آنکھوں میں ایک چمکدار ہیولا رقصاں تھا۔ وہ سب کچھ جو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری بند آنکھوں میں کوند رہا تھا۔

پھر میں نے اس بے لباس وجود کو اپنے نزدیک پایا۔ اس کا وزن میرے سینے پر تھا۔ میں بے جان ہوگیا تھا۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ تھی۔

"میں جانتی ہوں تم سو نہیں گئے۔"

"لباس پہن لو جھمیے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جھمیے۔ کل میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔"

"کیوں....؟"

"تو ہی میری دوست تھی۔ تو ہی تو میرے قریب تھی۔ اگر تجھے بھی مجھ سے زیادہ دوسروں پر اعتبار ہے تو ٹھیک ہے۔"

"کیا مطلب....؟" جھمیے چونک پڑی۔

"میں نے رمضان سے کوئی شکایت نہیں کی۔"

"پھر....؟" جھمیے کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ اس کا لمس مجھ سے پرے ہٹ گیا تھا۔ میں نے ایکبار بھی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"وہ خود ہی بکواس کر رہا تھا۔"

"کیا....؟"

"جہاں وہ گیا تھا جھمیے، وہ جگہ بہت بری تھی۔ ایسی بے حیا عورتیں وہاں موجود تھیں کہ میری طبیعت گھبرانے لگی۔ جب گانا ختم ہوگیا تو رمضان نے کہا کہ میں ان میں سے کسی کو پسند کرلوں۔ میں نے منع کر دیا۔ تب اس نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ میں تو جھمیے ہی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس پر میں نے یہ بات کہی کہ جھمیے.... جھمیے...." میں

اس سے آگے نہ کہہ سکا۔

جھمیے بھی ایک لمحے ساکت رہی اور پھر وہ پوری کی پوری مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میری آنکھوں رخساروں، گردن پر بہت سے بوسے دیئے اور اس کے بعد اس نے میرے پلنگ سے چھلانگ لگادی۔ میں نے کروٹ بدل لی تھی۔

پھر چند ساعت کے بعد اس نے میرے نزدیک بیٹھ کر مجھے پکارا.... "سرور۔" میرے سرور۔"

"میں تجھ سے ناراض ہوں جھمیے۔"

"معاف کردے۔ صرف ایک بار معاف کردے۔ بس پاگل ہوگئی تھی۔ بھول گئی تھی کہ تیرا نام سرور ہے اور یہ نام کبھی گندا نہیں ہو سکتا۔ بس ایک بار معاف کر دے۔ آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔ معاف کردے سرور۔ میں تیرے قدموں سے لپٹ کر تجھ سے معافی مانگتی ہوں۔" اس نے میرے پیروں پر سر رکھ دیا اور میں موم ہوگیا۔

"وعدہ کرتی ہوں سرور سے اور یہ وعدہ میرا ایمان ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔



مہینہ پورا ہوا تو میں نے پھر پندرہ سو روپے کا منی آرڈر گاؤں کر دیا۔ باقی پیسے میں نے اپنے خرچ کے لئے رکھے تھے۔ جن سے میں نے چند جوڑے کپڑے بنوائے اور کچھ دوسری چیزیں بھی خریدیں' اس سلسلے میں میری رہنمائی چھیمے ہی کیا کرتی تھی۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی میرے کپڑے دھونا' استری کرنا اور ایسے ہی دوسرے کام' میرا حلیہ ہی بدلتا جا رہا تھا' رمضان کے کام میں ابھی تک کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس رات جب میں مصنوعی قبر میں اتر گیا تھا اور رمضان کو میرے بارے میں تشویش ہوگئی تھی وہ بھی دور ہوگئی تھی کیونکہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے اسے خطرے کا

احساس ہوتا۔

پھر ایک دن میں آرڈر کی بوتلیں لئے ہوئے ایک دوکان پر پہنچا اس دوکاندار جس کا نام غفور تھا۔ چند لوگوں کے ساتھ عجیب سی شکل بنائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس نے دور سے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے کچھ عجیب سے اشارے کئے' جو میری سمجھ میں نہ آسکے' میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور میں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے غفور....؟"

"کون ہو تم' میں تمہیں نہیں جانتا۔" غفور نے بدحواس لہجے میں کہا لیکن اس کے نزدیک کھڑے ہوئے آدمی میری جانب متوجہ ہوگئے۔ یہ لمبے قد کے دو آدمی تھے جو خاصے بارعب نظر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی چار پانچ آدمی اور تھے۔ تب لمبے قد کے آدمی نے مجھ سے سوال کیا۔ "کون ہو تم....!" لمبے قد کے آدمی نے نرم لہجے میں سوال کیا اور غفور کا چہرہ فق ہوگیا۔

"اوہ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر رہا اس تھیلے میں کیا ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مال ہے۔ غفور کے لئے لایا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے' کون ہو تم' مجھے پھانسنے کے لئے یہ حرکت کر رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔" غفور نے بری طرح بپھرتے ہوئے کہا اور میں نے حیرت سے غفور کی شکل دیکھی۔ پھر کہنے لگا۔

کیا ہوگیا ہے اسے آج۔ روزانہ ہی تو مجھ سے مال لیتا ہے اور آج کہہ رہا ہے کہ مجھے جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ میں نے کہا۔" کیا آج تمہیں مال نہیں چاہئے غفور؟"

پھر وہی مال....!"

"اچھا خاموش رہو۔" لمبے آدمی نے غفور کی بات درمیان سے کاٹ دی اور پھر میرے تھیلے کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔" اس میں کیا ہے؟"

"بوتلیں ہیں جناب۔"

"ذرا دیکھیں ہم بھی۔" اس شخص نے کہا اور میں نے تھیلا پیچھے ہٹالیا۔" نہیں جناب یہ غفور کی امانت ہے۔"

"او ہو تو ہم بھی تو غفور کے آدمی ہیں۔ لاؤ ذرا۔" لمبے آدمی نے آگے بڑھ کر تھیلا میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے غفور کی جانب دیکھا۔ غفور کا چہرہ نجانے کیوں تاریک ہوگیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں تھیں اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔

لمبے آدمی نے تھیلے میں سے ایک بوتل نکالی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔" واہ میرے یار تو یہ مال لاتے ہو تم۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بوتل اپنے ساتھی کی طرف بڑھادی۔

"گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ اطلاع درست تھی' چلو بھائی نیچے غفور آ جاؤ۔ آج پھنس گئے اور تمہارے پھنس جانے سے ہمارے بہت سے کام بن جائیں گے۔ تم بھی آجاؤ بھائی۔ سردار آؤ ذرا ہمارے اوپر بھی سرداری کرو۔"

"مم مگر کہاں۔ ؟ مجھے تو بہت سے کام ہیں۔" اس شخص نے کہا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو اشارہ کیا دوسرے لمحے اس آدمی نے میرے اور غفور کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں' میں نے تعجب سے ان ہتھکڑیوں کو دیکھا' صرف سنا ہی تھا کہ ڈاکو اور چور قسم کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دی جاتی ہیں۔ عملی طور پر پہلی بار اپنے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی دیکھی تھیں اور میرے حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔

"یہ۔ یہ کیا ہے۔" میں نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"زیور سے پیارے زیور۔ مردوں کا زیور۔ چلو۔" اس لمبے آدمی نے کہا اور وہ لوگ ہمیں گھسیٹتے ہوئے ایک گاڑی کی جانب لے جانے لگے' بوتلیں قبضے میں کر لی گئی تھیں' غفورے کو دوکان بند کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ البتہ دوکان کے کواڑ بھیڑ دیے گئے تھے۔ ہاں ان لوگوں نے اپنا ایک آدمی وہاں تعینات کر دیا گیا تھا' مجھے اور غفور کو ایک عمارت میں لے جا کر ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ جب وہ سب لوگ باہر نکل گئے تو غفور میری جانب پلٹا۔ "الو کے پٹھے مروا دیا نا۔" اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور میں شدت غیظ سے کھڑا ہوگیا۔

"کیا تو نے مجھے گالی دی ہے۔" میں نے خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا اور دوسرے لمحے ہتھکڑی والا ہاتھ اس کے منہ پر دے مارا۔ غفور کرسی سے الٹ کر دوسری طرف جا پڑا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھا اور اپنے منہ سے بہنے والا خون صاف کرنے لگا۔

وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔ "نکل کر بتاؤں گا تجھے۔ میں بھی تجھ سے کمزور نہیں ہوں۔"

"تو نے مجھے گالی دی تھی غفور۔ یہ اس کا جواب ہے۔ ورنہ یہ سب کیا ہے مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"آبکاری کے لوگ ہیں حرامی۔ کسی نے مخبری کر دی تھی چھاپہ مارا۔ بس دو خالی بوتلیں ہاتھ لگ گئی تھیں لیکن میں نے بات نبھادی میں نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ یہ بوتلیں کون لایا تھا اور عین وقت پر تم آ مرے۔ ابے میں نے کتنے اشارے کئے تھے تجھے۔"

"میں نہیں سمجھا تھا مگر یہ آبکاری کیا ہوتی ہے؟"

"جو ہوتی ہے ابھی معلوم ہوئی جاتی ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔" غفور نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

یہ انتظار کئی گھنٹے کا تھا۔ پھر ہم دونوں کو اس کمرے سے نکال کر دوبارہ ایک گاڑی میں بٹھایا گیا اور اس بار میں نے پولیس کی شکل دیکھی۔ اب تو میرے حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

جس کمرے میں ہمیں لے جایا گیا وہ انوکھا تھا۔ پولیس افسر یہاں موجود تھے اور پھر ان میں سے ایک پولیس افسر نے غفور کو مخاطب کیا۔" دوکاندار تم ہو؟"

"جی صاحب۔ غفور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"کب سے بیچ رہے ہو؟"

"مم۔ مائی باپ۔ مم۔ میں۔ میں تو بے قصور ہوں۔ اس نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔ حولات میں اس نے مجھے مارا بھی ہے یہ دیکھیں یہاں خون نکلا تھا۔"

"تم بے قصور ہو.....؟"

"ہاں سرکار۔"

"وہ ڈنڈا دیکھ رہے ہو جو دیوار پر لٹکا ہوا ہے جانتے ہو اس پر کیا لکھا ہے۔"

"آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے۔" غفور نے پڑھا اور افسر ہنسنے لگا۔

"اور وہ بالما تم ہو! حامد۔ ذرا اتارو۔" افسر نے کہا اور ایک موٹے تازے آدمی نے ڈنڈا دیوار سے اتار لیا اور پھر اس نے غفور کو کھڑا کر دیا۔

"میں سرکار۔ مائی باپ۔ مر جاؤں گا۔ بتا رہا ہوں سب کچھ بتا رہا ہوں۔"

"تو بتاؤ نا۔" افسر نے ہنس کر کہا۔

"دو سال ہو گئے سرکار۔ دوکان ہی نہیں چلتی تھی۔ گزر نہ ہوئی تو کچی شراب بیچنا شروع کردی۔"

"کہاں سے خریدتے تھے؟"



"اس سے۔" غفور نے نفرت سے میری طرف اشارہ کیا اور میرے ذہن میں سناٹے اتر آئے۔ ایک خوفناک نام میرے حواس پر چھا گیا۔ کچی شراب۔ تو آج تک' آج تک میں جو مال سپلائی کرتا رہا تھا وہ شراب تھی۔ شراب۔ شراب۔ شراب۔ میرے اعصاب چیخنے لگے۔ وہ لوگ غفورے سے سوالات کرتے رہے اور میرا سر چکراتا رہا۔ پھر اس پولیس افسر نے ڈنڈے سے میرے بازو پر ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔

"اب آپ کی باری ہے مرد میداں اور لب کشائی کریں کہ ہمارے دیدۂ دل منور ہوں۔" اور میں نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

پولیس آفیسر کا چہرہ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اور میری آنکھوں میں میری بستی کا تقدس پھر رہا تھا۔ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ کرنے کے لئے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ لیکن میں۔ میں تو اس بات سے لاعلم تھا۔

"کیا پوچھا جا رہا ہے تم سے!" پولیس افسر دہاڑا۔

"میں آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا صاحب! مگر ایک شرط ہے۔" میں نے کہا۔

"شرط بھی آپ کی۔؟" پولیس افسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں اور اس شرط کے بغیر میں ایک لفظ بھی نہیں بتاؤں گا۔ یہ جتنے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں میں ان سب کو دعوت دے رہا ہوں کہ یہ ایک کے بعد ایک آئیں مجھے ڈنڈوں سے پیٹیں اگر میری زبان کھلوالی تو.... تو سو روپے دوں گا۔" میں نے اپنی جیب کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پورے سو روپے؟" پولیس افسر ہنس دیا۔

"ہاں پورے سو روپے' اتنے ہی ہیں میرے پاس!"

"شرط کیا ہے تمہاری! دوسرے بڑے افسر نے پوچھا۔ جو میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بھائیو۔ باپ انسان کے لئے ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ماں اس کی جنت ہوتی ہے اور بہنیں عزت' کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے۔"

"ٹھیک ہے آگے کہو۔"

"تو میں اپنے ایمان اپنی جنت اور اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ تمہیں بتاؤں گا بالکل سچ بتاؤں گا' اور شرط یہ ہے کہ تم اس میں سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں سمجھو گے!"

"خوب۔ چلو تمہاری شرط منظور ہے!"

"اس کھوے کو یا تو یہاں سے بھگا دو یا پھر اس سے کہو کہ زبان بند رکھے۔ ورنہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔" میں نے غفور کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

پولیس افسر کو شاید میری باتیں پسند آ رہی تھیں' وہ برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر اس نے غفور کی طرف انگلی اٹھائی "دیکھ بے کھوے۔ اپنی زبان بند رکھنا ورنہ زبان باہر نکال لی جائے گی' سمجھ گیا" سمجھ گیا سرکار' مگر وہ سالا جھوٹا ہے آپ اس کی.... غفور نے اتنا کہا اور چیخ پڑا۔ پولیس افسر نے اس کے کمر پر ٹھوکر رسید کی تھی۔ پھر اس نے اشارہ کیا اور دو کانسٹیبل غفور کو پکڑ کر باہر لے گئے۔

"یہ ہوئی بات!" میں نے ہنس کر کہا۔ اور پولیس افسر بھی ہنس پڑا۔

"تمہیں خوشی ہوئی سردار۔" پولیس افسر نے پوچھا۔

"ہاں صاحب! اس کی صورت دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ خیر چھوڑو۔ تو آپ نے مہربانی کر کے اسے باہر بھیج دیا۔ ہاں تو صاحب اب پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

"کتنے عرصہ سے یہ دھندا کر رہے ہو؟"

"دو تین مہینے ہوئے ہیں صاحب۔"

"مال کہاں بنتا ہے!"

"قبرستان میں !" میں نے اطمینان سی جواب دیا۔

"کون سے قبرستان میں !" اس نے پوچھا اور میں نے اطمینان سے اسے قبرستان کا پتہ بتادیا۔"

"تمہارے کتنے ساتھی ہیں؟"

"بہت سے ہیں صاحب۔ بہت کے نام بھی نہیں معلوم ہیں۔ ویسے ان سب کا استاد وہی حرامی رمضان ہے۔"

"رمضان کون ہے؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"کہنے کو تو وہ گورکن ہے۔ قبریں کھودتا ہے' مگر اس کا اصل دھندہ یہی ہے۔ ارے گر مجھے معلوم ہوتا تو میں تو پہلے ہی اسے ٹھیک کر دیتا۔ کمزور نہیں ہوں اس سے۔ بس گھروالوں کا خیال آ جاتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اب اپنی صفائی بھی پیش کرنے لگے!"

"صفائی وفائی کی ایسی تیسی میں نے شراب کا نام ضرور سنا ہے۔ صاحب پر کبھی دیکھی نہیں تھی سالی۔ ایک بوتل پر پندرہ روپے ملتے تھے!" "تم کون ہو رمضان کے ؟"

"ارے اس سسرے کا کون ہوت' میرا اور اس کا کیا جوڑ صاحب میں تمہیں پوری بات بتاؤں' گاؤں سے آیا تھا کراچی کہ نوکری کروں گا۔ زمیندار جی نے اپنے پیسوں کے لئے بھیجا تھا' خدا ان کا بھلا کرے۔ پر اس کراچی کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جسے دیکھو یوں اکڑا پھرتا ہے۔ جیسے سالا تھانیدار لگا ہو کہیں کا۔ بارش میں ایک گھر میں گھس گیا تو انہوں نے چور سمجھا۔ قبرستان میں پناہ لی تو رمضان نے پکڑ لیا۔ بس پھر رمضان نے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔ بڑی ہمدردی جتائی تھی سسرے نے۔ کہنے لگا کہ ایسا رکھوں گا یہاں پر جیسے شہزادے رہتے ہیں۔ صاحب کراچی میں اپنی جان پہچان والا کوئی نہیں ہے۔ ایک تھا۔ مگر اس کا پتہ اتنی بڑی بستی میں چلانا بڑا مشکل ہے' سو ہم نے سوچا صاحب جی کہ ٹھیک ہے۔ مگر وہ بڑا ہی غلط آدمی ہے صاحب' آج پتہ چلا کہ وہ ہے ہی بدمعاش' بچھیے بیچاری پر اتنا ظلم کرتا ہے کہ بس پوچھو ہی مت۔ تو صاحب اس نے ہم سے کہا کہ تھیلوں میں رکھ کر یہ بوتلیں دوکانوں میں دے آیا کر' میں نے سوچا کام کونسا بڑا کام ہے اور پھر نوکری تو کرنی ہی ہے' ہم نے اس کی بات مان لی' پر خدا کی قسم صاحب ہم نے اتنی بڑی قسمیں کھائی ہیں' اور دیکھو صاحب جی' انسان کے پاس دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ماں باپ یا عزت۔ اور ان چیزوں کی قسم کھا کر انسان جھوٹ نہیں بولتا۔"

"ہوں!" پولیس افسر میری باتوں پر غور کرنے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔" تو تم تین مہینوں سے اس کے پاس ہو۔؟"

"ہاں صاحب جی!"

"اچھا سردار ایک بات اور بتاؤ!"

"جی صاحب پوچھو۔" میں نے مستعدی سے کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ رمضان شراب خود بناتا ہے یا کہیں سے لاتا ہے....؟"

"خود بناتا ہے صاحب' ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہے' اب تو بہت ساری باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔"

"اچھا اچھا مگر اس کی بھٹی کہاں ہے !"

"وہیں قبرستان میں !"

"کہاں۔؟"

"ایک قبر کے نیچے !"

"تم اس کا پتہ بتا سکتے ہو۔؟"

"کیوں نہیں بتا سکتے' جب ہم نے آپ کو ساری باتیں بتا دیں تو یہ بات بتانے میں کیا حرج ہے۔ ہمیں خود پتہ نہیں تھا بس ایک دن قبر میں روشنی دیکھی تو نیچے اتر گئے' وہاں ہم نے بہت سے آدمیوں کو کام کرتا دیکھا رمضان کا خیال تھا کہ کسی کو بتا دیں گے' اور اس نے اس کے لئے ہم سے بہت سی قسمیں لیں' اور کہا کہ کسی کو بتانا مت' پر صاحب یہ شراب والی بات خدا کی قسم ہم کو معلوم نہیں تھی۔"

"خوب !" پولیس افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔" اچھا سردار یہ بوتلیں کہاں کہاں پہنچاتے تھے۔"

"صرف دو تین دوکانیں معلوم ہیں صاحب۔ ہم تمہیں ان کا پتہ بتا سکتے ہیں' ہمارے علاوہ دوسرے لوگ بھی یہ کام کرتے ہیں !"

"تم ہمیں صرف ان دوکانوں کا پتہ بتادو!"

"پتہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ پہلے ہمیں قبرستان لے چلو یہاں سے ہم تمہیں ان دوکانوں پر پہنچا دیں گے !"

"ٹھیک ہے۔ مرزا.... چھاپے کی تیاریاں کرو' زیادہ دیر کرنے سے اسے شبہ بھی ہو سکتا ہے۔" پولیس افسر نے دوسرے آدمی سے کہا اور وہ باہر نکل گیا۔ ایک اور افسر بیٹھا گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ شخص بن تو نہیں رہا۔؟"

"کیوں؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"ارے بڑے سور ہوتے ہیں یہ لوگ' بھولے بن کر بے وقوف بنانے کی کوشش

کرتے ہیں۔"

"ہمارے بارے میں کہہ رہے ہو صاحب' تم تو صورت سے ہی بے وقوف نظر آتے ہو۔ ہم کیا بتائیں گے۔" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

"سردار!" پولیس افسر نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو یہ ہمیں گالی کیوں دے رہے ہو۔ پستول پڑا ہے ان کی گردن میں کھو اتاریں اور گولی مار دیں' پر ہاتھ جوڑا ہے میں نے صاحب گالی نہ دیں۔"

"زبان بند رکھو!"

"اس سے بھی کھو زبان بند رکھے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں ایاز۔ سیدھا سادا آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جھوٹ نہیں بول رہا۔" پولیس افسر نے کہا۔ ایاز کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ تب پولیس افسر نے کہ۔" دیکھو سردار تم مجھے برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ تمہیں ایک تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ دماغ ٹھنڈا رکھا کرو' برداشت کی قوت پیدا کرو' ورنہ پولیس کے چنگل میں پھنس کر آدمی کچھ نہیں رہتا۔"

"مگر صاحب کیا گالی بھی برداشت کر لیا کریں۔؟"

"سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے دوست۔ بہرحال تم پولیس کی مدد کرو' میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کسی مصیبت میں نہ پھنسنے دوں۔"

"تیار ہوں صاحب۔ تم چلو تو صحیح۔" میں نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوسرا آدمی آگیا جسے تیاریوں کے لئے کہا گیا تھا اور اس نے آکر اطلاع دی کہ تیاریاں مکمل ہیں' چنانچہ افسر مجھے باہر لے کر نکل آیا۔

پولیس کی کئی گاڑیاں چل پڑی۔ بڑی تیاریاں کی گئی تھیں' ایک گاڑی میں' میں بھی افسر کے ساتھ' میرے ہاتھوں میں بدستور ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم قبرستان کے قریب پہنچ گئے۔ پولیس کی گاڑیاں قبرستان کے چاروں طرف پھیل گئی تھیں اور پولیس والے ان سے کود کود کر قبرستان کی دیواروں پر چڑھنے لگے اور پھر دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

میں جس جیپ میں بیٹھا تھا وہ قبرستان میں داخل ہو گئی۔

"رمضان کہاں ملے گا؟" افسر نے مجھ سے پوچھا۔

وہ اس طرف!" میں نے رمضان کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"اور قبر کہاں ہے۔ جس کے نیچے تہہ خانہ ہے۔"

"وہ.... اس درخت کے نیچے۔" میں نے قبر کی نشاندہی بھی کر دی۔ اور پولیس افسر نے اپنے چند آدمیوں سے میری نگرانی کرنے کے لئے کہا۔ اور پھر خود جیپ سے اتر کر بہت سے پولیس والوں کے ساتھ مکان کی طرف بڑھ گیا۔ قبرستان میں پولیس ہی پولیس نظر آ رہی تھی' اور مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

پولیس والے رمضان کے مکان میں گھس گئے' اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بہت سے لوگوں کو پکڑے ہوئے باہر نکل آئے۔ قبر کے نیچے بھٹی سے آدمی پکڑے گئے تھے' کوئی بھی بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پکڑے جانے والوں میں رمضان بھی تھا اور چھیمے بھی۔

چھیمے کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر پولیس والے شراب بنانے کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر رکھنے لگے۔ اور فوٹوگرافر تصویریں بنانے لگے۔ کافی دیر تک وہ لوگ قبرستان میں رکے رہے تھے۔ چھیمے اور رمضان کو بھی اس جیپ میں بٹھا دیا۔ جس میں میں موجود تھا' رمضان نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔ پھر وہ گردن ہلا کر بولا۔

"تجھ سے یہی امید تھی سردار' جانتا تھا کہ ایک دن تو ہی مروائے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' خاموشی سے چھیمے کی طرف دیکھنے لگا۔ چھیمے کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس افسر واپس آگیا اور پھر اسی جیپ میں بیٹھ گیا۔

"چلو...." اس نے کہا۔" پولیس کی خاصی تعداد قبرستان میں رک گئی تھی۔ باقی لوگ ہمارے ساتھ چل پڑے۔" راستے میں پولیس افسر نے مجھ سے کہا۔

ہاں دوست اب تم ہمیں ان دوکانوں پر لے چلو۔ جہاں جہاں تم شراب سپلائی کرتے تھے۔"

"ٹھیک ہے صاحب پہلی دوکان تو اس طرف ہے' اس طرف چلئے!" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ اور رمضان نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ چھیمے نے بھی ایک بار میری طرف سہمے ہوئے انداز میں دیکھا تھا۔ لیکن میں ان باتوں میں نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تو خود اس بات پر غصہ تھا کہ مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میں کیا چیز دوکان پر سپلائی کرتا تھا۔ شراب سے تو مجھے بچپن ہی سے نفرت تھی' ہماری بستی کے کچھ لوگ بھی شراب پیتے تھے' اور شراب پینے کے بعد ایسی حرکتیں کرتے تھے کہ ہر شخص ان پر نفرت کی نگاہ ڈالتا تھا۔ مجھے اس وقت سے اس چیز سے بے پناہ نفرت تھی' اگر میری بستی کے لوگ سن لیتے کہ میں اس شہر میں کیا کام کرتا ہوں تو سچی بات یہ ہے کہ

میں منہ دکھانے کے لئے دوبارہ بستی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے بھلا رمضان کی ان خونی نگاہوں کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ اس دوکان پر پہنچ گئے جہاں میں شراب کی بوتلیں لے جایا کرتا تھا' اس دوکاندار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ یکے بعد دیگرے ان تمام دوکانداروں کو گرفتار کر لیا گیا جو اس کام میں ملوث تھے' شراب کی بوتلیں بھی وہاں سے برآمد ہوئی تھیں۔

"اور کوئی دوکان باقی ہے۔" پولیس افسر نے پوچھا۔

"نہیں صاحب! میں انہیں کے بارے میں جانتا تھا۔"

"باقی کے بارے میں ہمارا دوست رمضان بتائے گا۔" پولیس افسر نے رمضان کی صورت دیکھتے ہوئے کہا' اور رمضان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اچھا۔" انسپکٹر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب یہ تو آگے چل کر پتہ چل جائے گا۔" رمضان نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔ اور انسپکٹر اسے دیکھ کر گردن ہلانے لگا۔"

"ٹھیک ہے دوست' پولیس کی نوکری کر رہے ہیں۔ ہر طرح کے حالات سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

"لیکن ان حالات سے نہیں نمٹ سکو گے۔" رمضان بڑے غرور سے بول رہا تھا۔

"تم اب بکواس بند کرو' ورنہ تم آنے والے حالات کو دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ سکو گے۔" پولیس افسر کا لہجہ خونخوار ہو گیا۔ پھر ہم تھانے پہنچ گئے۔ رمضان کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا' البتہ میں نے چھیمے کے لئے سفارش کی تھی!

"افسر صاحب یہ لڑکی بالکل بے قصور ہے' رمضان دادا نے اس پر اتنے ظلم کئے ہیں کہ یہ اب مزید ظلم نہیں سہہ سکتی' جس طرح میں نے اب تک آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس طرح آپ کے سامنے اس مسئلے میں بھی جھوٹ نہیں بولوں گا' یہ بڑی نیک اور شریف لڑکی ہے' اور اس کا ان حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے....."

"ٹھیک ہی سردار' اگر ایسی بات ہے تو ہم اس کا خیال رکھیں گے۔ تم بے فکر رہو!"

"اسے بھی تھانے میں بند کرو گے؟" میں نے افسردگی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ خانہ پری کرنے کے لئے اس کا بیان لیا جائے گا اور اس کے بعد اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جہاں یہ حفاظت اور آرام سے رہ سکے گی' تم اتنے اچھے آدمی ہو' میں تمہاری بات ٹال نہیں سکتا ہوں۔"

"شکریہ انسپکٹر صاحب' آپ واقعی شریف آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شریف لوگوں کے ساتھ ہم شریف ہی رہتے ہیں' تمہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے سردار۔ ہاں یہ تو بتاؤ کیا رمضان ہی اس سارے کاروبار کا سربراہ ہے۔"

"ہاں افسر صاحب' ہم نے اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا یہ ہی سب پر حکم چلاتا ہے' کیوں چھیمے تم بھی تو بولو۔"

"میں کیا بولوں!" چھیمے گردن جھکائے جھکائے بولی۔

"ارے بولو اب تو تم پولیس والوں کے پاس ہو' اور تم نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا چھیمے کہ رمضان دادا شراب بناتا ہے۔" چھیمے نے مجھے ایسے دیکھا جیسے شکایت کر رہی ہو۔ کہہ رہی ہو' جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں' ان باتوں سے تمہیں اور مجھے کیا فائدہ ہوا اور رمضان کے گرفتار ہونے سے ہی ہم دونوں کو کیا مل جائے گا۔ رمضان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

پولیس افسر واقعی مہربان انسان تھے' میرے اور چھیمے کے ساتھ وہ بہت اچھی طرح پیش آ رہا تھا۔ باقی تمام گرفتار ہونے والوں کو بھی لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ اور مجھے رات کو دوسری کوٹھری میں پہنچا دیا گیا تھا۔

"افسر صاحب' چھیمے کے ساتھ کیا سلوک کریں گے آپ؟"

"تم اطمینان رکھو سردار' میں نے اس کا بیان لے لیا ہے۔ آج رات تو وہ یہیں رہے گی' کل اسے دارالامان بھجوا دیا جائے گا۔"

"یہ کہا ہوتا ہے افسر صاحب؟"

"ایک سرکاری ادارہ ہے' وہاں یہ اطمینان سے رہے گی' اور اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی!"

"افسر صاحب آپ بہت اچھے انسان ہیں' میں آپ کے اس احسان کا بدلہ کبھی نہ کبھی ضرور اتارنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا اور افسر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے بعد مجھے چھیمے کا کوئی حال نہیں معلوم ہوا۔ افسر سے بھی تیسرے دن ملاقات ہو سکی' رمضان دادا کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ جیل بھیج دیا گیا' مجھے چند روز لاک اپ میں ہی رکھا گیا اور پھر ایک دن ہم سب کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

رمضان دادا بھی جیل سے آیا تھا' اس وقت تک ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا' رمضان دادا کھسک کر میرے قریب آ گیا اور اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔

"بیٹا سردار.... سب پتہ چل گیا ہے مجھے۔ سب تیرا کیا دھرا ہے لیکن بچو بھول گیا یہ

بات کہ دونوں پھر ملیں گے' باہر میں بھی نکلوں گا اور تو بھی یہیں ہوگا!"

"میں نے کیا کیا ہے رمضان؟"

"میری شرافت کا یہی صلہ دیا تو نے سردار.... شہزادوں کی طرح رکھا تھا تجھے سب کچھ دے دیا تھا میں نے!"

"لیکن میں نے کیا کیا۔"

"بھٹی پر چھاپہ کس نے ڈلوایا۔؟"

"میں نے۔"

"دوکانوں کا پتہ کس نے بتایا۔؟"

"وہ بھی میں نے بتایا۔ مگر میں نے کہا نا کہ یہ دھندہ تو مجھے پسند بھی نہیں تھا' اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں کبھی تمہارے ساتھ کام نہیں کرتا۔"

"اچھا بیٹا۔ ٹھیک ہے' وقت آنے دے۔"

"وقت کی بات مت کرو رمضان میں بھی ہاتھ پاؤں رکھتا ہوں۔ کیا تم مجھے چوہا سمجھتے ہو' مجھے بھی غصہ آگیا۔" اسی وقت پولیس والے ہمیں لینے آ گئے۔ مجسٹریٹ صاحب بیٹھ گئے تھے۔

"ہمارا چالان پیش کر دیا گیا' اور پھر ہمارے بیانات بھی لئے گئے' اس کے بعد مجھے بھی جیل بھیج دیا گیا۔

جیل کی دنیا بھی عجیب تھی۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہوئی' میں اس جگہ سے بہت دور تھا جہاں رمضان دادا کو رکھا گیا تھا' اس لئے جیل میں رمضان سے ملاقات نہ ہو سکی' البتہ دوسری پیشی پر وہ پھر ملا تھا۔ اس روز اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی



پھر کئی پیشیاں ہوئیں اور اس کے بعد ہمیں سزا سنا دی گئی۔ رمضان دادا اور اس کے کئی ساتھیوں کو ایک ایک سال کی قید ہوئی تھی۔ مجھے تین مہینے کی سزا دی گئی' بہرحال شراب میرے پاس سے بھی برآمد ہوئی تھی۔ سزا کاٹنے کے لئے ہمیں جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن اب ہم باقاعدہ قیدی تھے اور ہمارے ساتھ جیل والوں کا رویہ بدل گیا تھا۔

مجھے جس کوٹھری میں رکھا گیا یہاں پانچ قیدی اور تھے' ایک سے ایک شریر فطرت' ہر ایک کے جرم سنگین' مجھ سے طرح طرح کی گفتگو کی تھی' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا' نذیر خان نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"آؤ معشوق یار بن جائیں' کیا کام دکھایا تھا۔؟"..... اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بے گناہ ہوں۔" میں نے کہا۔

"واہ رے واہ' پہلی بار آئے ہو شاید؟"

"کیا مطلب؟"

"ایسی معصومانہ باتیں پہلی بار آنے والے ہی کرتے ہیں' جو دو چار بار آتے ہیں وہ یہ جملے بھول جاتے ہیں' ہم تو یار ہیں ہم سے کیا چھپانا۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ بھی نہیں بولتے۔ واہ.... تو پھر یار جیل میں کیوں آ گئے' کسی مسجد کے موذن ہوتے۔ خیر تمہاری مرضی۔ کتنے دن کے لئے آئے ہو؟"

"تین ماہ کے لئے۔"

"بس۔ اب یار دیکھنے میں تو شیر لگتے ہو' تین ماہ کی قید بھی کوئی قید ہوتی ہے' بہرحال ٹھیک ہے' برے کاموں میں سب سے اچھا کام سراب بنانا.... وہ وہ گر جانتا ہوں شراب بنانے کے کہ دنیا جانتی ہے۔ اور پھر یہ تو ایک نیک کام ہے' دن بھر کے تھکے ہوئے لوگ اگر لال پری کی آغوش میں پناہ نہ لیں تو پھر انہیں اور کہاں پناہ مل سکتی ہے بس۔ بڑے ثواب کا کام ہے جانی' اور پھر دھندہ بھی خوب ہی جاتا ہے۔"

"مجھے شراب سے نفرت ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"ابے کفر بکتا ہے' کسی شرابی کی بددعا لگ گئی تو کبھی نہ پنپ سکے گا۔ شراب سے نفرت مت کرنا۔"

"ابے نذیر خان۔ یہ تیرے کام کا آدمی نہیں ہے۔" شیر عالم نے کہا۔ اور میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ادھر آؤ بیٹے۔ میرے پاس بیٹھو۔" اور میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

"اس کی باتوں میں مت آنا۔ ہمیشہ حلال کی کھاؤ۔ شراب تو ہمارے مذہب میں بھی حرام ہے۔ ایسا کام کیوں کیا جائے کہ انسان ایمان بھی کھو بیٹھے۔" میں تمہیں قینچی کا کھیل سکھاؤں گا' مہینے میں ایک بار کام کرو اور اس کے بعد سکون سے بیٹھ کر کھاؤ۔ خدا کے بندوں کو روز روز پریشان مت کرو۔"

"قینچی۔ قینچی کا کھیل۔" میں نے پوچھا۔

"شیر عالم کا مطلب ہے جیب تراشی!"

"یہ فن ہے بیٹے' اور فنکار مجرم نہیں ہوتا!"

"فضول باتیں مت کرو' میں ان میں سے کوئی کام نہیں سیکھوں گا۔" میں غصیلے لہجے میں بولا اور وہاں سے بھی اٹھ گیا۔

"لو۔ دنیا میں کچھ سیکھو گے بھی یا نہیں۔ جیل میں بیٹے تمہیں اور کیا ہنر سکھایا جا سکتا ہے۔" شیر عالم نے کہا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

بہرحال جیل کے دن جیل کی راتیں گزرتی رہیں' یہ سارے فنکار مجھے اپنے اپنے ہنر سکھانے کی پیش کش کرتے رہے' لیکن میں یہ ہنر سیکھنے کے لئے تو کراچی نہیں آیا تھا' نہ جانے گھر والوں کا کیا حال ہو۔ طویل عرصہ سے انہیں میری خبر نہیں ملی ہوگی!

لیکن اس بات کا سکون تھا کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں ہی میں نے انہیں اتنی رقم بھیج دی تھی کہ وہ مزید طویل عرصہ سکون سے گزار سکتے تھے' اس دن کے لئے میں زیادہ پریشان نہیں تھا' بہرحال جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو پورا ہو کر رہے گا!

رمضان دادا بھی اسی جیل میں تھا' لیکن اتفاق تھا کہ تین مہینے کے دوران ایک بار بھی میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی' اور اچھا ہی تھا' کیونکہ یہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوتی' میں نے اپنی قید کے دنوں کا حساب نہیں رکھا تھا۔ پھر ایک دن مجھے جیلر صاحب نے طلب کیا۔ اور میں ان کے سامنے پہنچ گیا۔

"سردار علی! تمہاری قید کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ آئندہ اچھے انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرنا!"

"اچھا صاحب' تو پھر اب میں کیا کروں؟"

"اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں یہاں سے لے لو' اور کرم دین انہیں باہر چھوڑ آؤ۔" جیلر نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد میں جیل کی چار دیواری کے باہر نکل آیا۔

باہر کی دنیا پہلے جیسی تھی' نہ جانے کیوں مجھے جیل سے باہر نکلنے کا دکھ ہوا' کم از کم چھت تو تھی' زندگی محدود تو تھی' ایک ایک لمحے کا خوف تو نہیں تھا۔ یہ احساس تو نہیں تھا کہ پھر کسی غلط آدمی سے نہ ٹکرا جاؤں۔ اور وہ کسی مصیبت میں پھنسا دے.... لیکن اب.... بے یارو مددگار کھڑا ہوا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں کھڑے رہنا بھی تو بے مقصد تھا' چلتا رہا.... چلتا رہا۔ اور نجانے کہاں سے کہاں نکل آیا۔

پھر ایک فٹ پاتھ پر لوگوں کو دیکھا۔ بیٹھے ہوئے تھے' ایک طالب علم پڑھ رہا تھا۔

میری ہمت ہوئی اور میں بھی وہاں جا کر گھاس پر بیٹھ گیا' طالب علم مجھ سے چند گز دور تھا ایک بار اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ اس سے کچھ بات کروں' اور میں ہمت کرنے لگا' پھر دوبارہ وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے اسے سلام کیا' وہ جواب دے کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"بھائی صاحب یہ کونسی جگہ ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"اس جگہ کا کیا نام ہے؟"

"گرومندر' کیا تم یہاں اجنبی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ کہاں سے آئے ہو؟"

"ایک دیہات سے؟"

"نوکری کرنے۔؟" وہ خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں!"

"نوکری ملی؟"

"نہیں!"

"کھانا کھایا؟"

"کھانا.... ہاں کھا لیا۔"

"کرائے کے لئے پیسے نہیں ہوں گے کہ گھر واپس جاسکو۔" اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

"نہیں میں گھر واپس نہیں جاؤں گا!"

"اوہ.... کیا کام کر سکتے ہو۔؟"

"پڑھا لکھا تو ہوں نہیں' بے پڑھے لکھے لوگوں کو جو کام مل سکتا ہے ضرور کروں گا!"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں!"

"کچھ نہیں! میرا دل گھبرا رہا تھا تو تم سے باتیں کرلیں مجھے افسوس ہے کہ تمہاری پڑھائی میں حرج کیا...." میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا اور دوسری طرف متوجہ ہوگیا۔

طالب علم پڑھنے لگا تھا' لیکن پھر اس نے کئی بار مجھے دیکھا۔ انداز عجیب تھا' تھوڑی

دیر کے بعد وہ کھسک کر میرے پاس آگیا۔" جانتے ہو یہاں کیا ہوتا ہے۔؟"

"ایں....؟" میں چونک پڑا۔ "کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھا۔"

"ہر گلی کوچے میں تباہ حال مسافر ملتے ہیں۔" نوجوان بولا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا!"

"جو کہیں سے آئے ہوتے ہیں' راستے میں ان کی جیب کٹ گئی ہوتی ہے۔ اور ان کے پاس واپس جانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے وہ بس کرایہ مانگتے ہیں۔ اور بعض خداترس انہیں کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں' لیکن جو بمشکل کچھ رقم انہیں دے دے' اگر ایک ہفتے یا اس کے دوسرے ہی دن کسی اور مقام پر کرایہ مانگتے دیکھے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔"

"اوہ! تو وہ لوگ دھوکہ دیتے ہیں۔؟"

"ہاں! بڑے بڑے فنکار پڑے ہوئے ہیں یہاں۔ مجھے معاف کرنا میں تمہیں بھی ان میں سے ایک سمجھا تھا!"

"نہیں! میں ان میں سے نہیں ہوں۔"

"کہاں رہتے ہو۔؟"

"میں نے کہا کہیں نہیں رہتا۔ ابھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ لیکن جلد ہی کہیں نوکری کرکے ٹھکانہ بھی بنالوں گا!"

"گاؤں واپس نہیں جاؤ گے؟"

"مرد کے قدم کبھی واپس نہیں جاتے!"

"واہ عمدہ بات کہی ہے کیا نام ہے تمہارا؟"

"سردار علی!"

"میرا نام غیاث ہے۔ مگر سردار علی کیسی نوکری کرو گے تم۔؟"

"جیسی بھی مل گئی' اللہ مالک ہے۔"

"میں جیکب لائن میں رہتا ہوں سردار۔ باپ مرگیا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے اور ماں ہے' انٹر میں پڑھ رہا ہوں' صبح کو میں اخبار ڈالتا ہوں گھروں میں۔ وہ میری سائیکل دیکھ رہے ہو۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا' اور میں نے سائیکل دیکھ کر گردن ہلادی۔" اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لگا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"یار آٹھ بجے مجھے کالج جانا ہوتا ہے' اس لئے زیادہ کام نہیں کرتا' بس قریب کے گھروں کو پکڑ لیا ہے' لیکن اگر تم چاہو تو تھوڑا سا کام بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"وہ کس طرح۔؟"

"قریب کے گھروں میں تم اخبار ڈال دیا کرو' میں ذرا دور نکل جاؤں گا۔ ایجنسی کا مالک کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔ تمہیں اتنی آمدنی ضرور ہو جائے گی کہ وقتی طور پر کام چل جائے' ورنہ تمہارے پاس تو پورا دن ہے۔ بعد میں کوئی اور دھندہ دیکھ لینا' یوں سمجھو کہ صبح کو اس وقت جب لوگ سو کر بھی نہیں اٹھتے ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے' اور ہم دس بارہ روپے کما لیتے ہیں!"

"واہ...." میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کیا تم میری یہ مدد کر سکتے ہو غیاث۔؟"

"ہاں! یقیناً اس کے بعد میں تمہیں قسطوں پر سائیکل دلا دوں گا اور پھر تم بھی دور نکل جایا کرنا اس کراچی میں انسان کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ بس ذرا محنت کرنی ہوتی ہے!"

"میں محنت سے نہیں گھبراتا غیاث!"

"تو ٹھیک ہے سردار.... آؤ چلیں۔ میں اپنی ماں سے تمہارا تعارف کرادوں اور ہاں تم ہمارے ساتھ بھی رہ سکتے ہو!"

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے لگا' انوکھے خیالات ذہن میں آ رہے تھے' دل چاہ رہا تھا کہ اس ہمدرد دوست کو اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں' لیکن پھر عقل نے ساتھ دیا اور خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی' یہاں کے لوگ حقیقتوں کو برداشت نہیں کرتے۔

غیاث مجھے اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر لے چلا' تھوڑے سے فاصلے پر ایک غریب سی بستی میں اس کا گھر تھا' چٹائیوں اور بانسوں سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی تھی' جس میں ایک کمرہ بنا تھا اور اس پر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی اس کے بعد صحن تھا اور صحن کے بعد چٹائی کی چھت والا ایک کمرہ جو غیاث کا تھا' غیاث نے سائیکل اندر کھڑی کی اور پھر مجھے بھی اندر لے آیا۔ اور اپنے کمرے میں بٹھا دیا اور وہ اندر چلا گیا اور نہ جانے اپنی ماں سے کیا باتیں کرتا رہا۔ پھر ایک خاتون اس کے ساتھ اندر آئیں!

"سادہ سے نقوش اور سادہ لباس پہنے ہوئے تھیں' میں نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے خلوص سے جواب دیا۔ "بیٹھو بیٹے۔ غیاث نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ میں خوشی سے تیار ہوں' تم یہاں رہو اور کام کرو' غیاث میرا اکلوتا بیٹا ہے' اب میں سمجھوں گی کہ میرے دو بیٹے ہو گئے۔"

"میں خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ "بس بیٹے' غریبوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا' ہاں ہم لوگ اپنے منہ سے اپنے آپ کو عزت دار ضرور کہہ لیتے ہیں' یہی شاید سرمایہ ہوتا ہے اور یہاں رہ کر اس سرائے کی حفاظت بھی کرنا ہوگی!"

"مجھ سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی ماں جی!"

"بڑی خوشی سے یہاں رہو۔ اس جھونپڑی کو اپنی سمجھو' غیاث ایک پلنگ اندر سے لا کر یہاں ڈال لینا اور اور دونوں بھائی یہیں رہنا۔"

"جی امی۔" غیاث نے جواب دیا۔

"یہ سہارا میرے لئے بہت بڑا تھا۔ دوسرے ہی دن غیاث مجھے اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر لے گیا اور وہ گھر دکھا دیئے جہاں مجھے اخبار ڈالنے تھے۔ میں نے اچھی طرح وہ سارے گھر ذہن نشین کر لئے تھے۔

اور پھر تیسرے دن سے میں نے اپنا کام شروع کر دیا' بڑا ہی اچھا تھا یہ چھوٹا سا خاندان' بہت مخلص' غیاث حسب معمول کالج چلا جاتا' دوپہر کو آتا پڑھنے چلا جاتا اور پھر شام کو ہم دونوں مل کر گپیں ہانکتے تھے' میں نے آج تک غیاث پر اپنی پچھلی زندگی ظاہر نہیں کی تھی۔

لیکن اکثر مجھے ماضی کا خیال آ جاتا تھا۔ گھر والے یاد آتے' انہیں خط ڈالنے کو جی نہیں چاہتا تھا' کیا لکھتا' تین مہینوں کے بارے میں کیا کہتا' پھر ایک دن مجھے چھیمے یاد آئی' وہ مظلوم لڑکی' اور دل اتنا بے تاب ہوا اس کے لئے کہ میں گھر سے نکل آیا۔ میں نے سوچا اس کے بارے میں معلومات کہاں سے حاصل کروں۔ پولیس افسر نے مجھے بتایا تو تھا کہ وہ کسی سرکاری ادارے میں بھیج دی گئی ہیں۔ لیکن کہاں۔ یہ نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال میں پولیس تھانہ پہنچ گیا اور سیدھا اندر چلا گیا' لیکن وہاں ایک دوسرا افسر بیٹھا ہوا تھا۔

"وہ کہاں گئے۔؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جو دوسرے افسر صاحب تھے یہاں۔؟"

"اوہ! وہ یہاں سے چلے گئے' کیا کام ہے تمہیں۔؟"

"وہ جی چھیمے کے بارے میں پوچھنا تھا۔

"کون چھیمے۔؟"

وہی جو رمضان کے ساتھ رہتی تھی۔" میں نے کہا اور پولیس افسر مجھے گھورنے لگا۔ پھر اس نے کسی کو آواز دی۔

"اکرم خان' اس کی سنو کیا کہہ رہا ہے۔" پھر ایک اور نیا آدمی وہاں آ گیا' لیکن میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی اور ان لوگوں نے مجھے یہاں سے بھگا دیا۔ بڑی

انوکھی دنیا تھی یہ بڑے ہی عجیب لوگ تھے' میں افسردہ سا واپس آ گیا' امی اور روشن مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتی تھیں' روشن غیاث کی بہن تھی۔ بارہ تیرہ سال کی بچی لیکن اس بستی کے ماحول سے الگ۔

یہ بھی شریف خاندان کے مصبت زدہ لوگ تھے' کوئی سرمایہ نہیں تھا بس زندگی گھسیٹ رہے تھے' بہرحال یہاں میرے دن اچھے گزر رہے تھے۔

لیکن کراچی پرسکون نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ نت نئے ہنگاموں سے دوچار رہتے ہیں' اور اب تو میں بھی یہیں کا ایک باشندہ تھا' چنانچہ میں کس طرح پرسکون رہ سکتا تھا' غیاث کے ساتھ رہتے ہوئے دوسرا مہینہ تھا' دو مہینے کی آمدنی تقریباً تین سو روپے تھی جس کے بڑھنے کی امید بھی تھی۔ لیکن اب میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ باقی دن بے کار نہیں جانا چاہئے' غیاث نے بھی مشورہ دیا تھا کہ اور ہم لوگوں نے بہت سے پروگرام بنائے تھے۔

گھروں سے اخبار کے بلوں کی وصولیابی کے بعد غیاث نے تین سو روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے' اور میں سارے پیسے امی کو دے دیئے۔

"ارے میں کیا کروں ان کا بیٹے؟"

"آپ رکھیں امی۔ کیا میں غیاث سے الگ ہوں؟"

"نہیں وہ تو ٹھیک ہے' لیکن تمہارا خرچ بھی تو ہے۔"

"آپ غیاث کو روزانہ کیا دیتی ہیں؟"

"مگر غیاث میں اور تم میں فرق ہے' تمہارے اخراجات ماشاء اللہ زیادہ ہوں گے اور پھر تمہیں گھر بھی تو بہت کچھ بھیجنا ہوگا!"

"ان میں سے کیا بھیجوں گا میں' آپ یہ رکھ لیں' مجھے بس تھوڑے سے پیسے روزانہ خرچ کے لئے دے دیا کریں۔"

میرے زیادہ مجبور کرنے پر امی نے پیسے رکھ لئے اور طے یہ ہوا کہ سو روپے لے لیں گے' سو روپے میرا خرچ اور سو روپے رکھ لئے جائیں گے تاکہ جمع کر کے گھر بھجوا دیئے جائیں! بہرحال اب مجھے دوسری نوکری کی تلاش تھی اور اس کے بعد میں سنجیدگی سے کسی ملازمت کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔"

"غیاث میرا بہترین دوست بن گیا تھا' اس نے فالتو وقت میں مجھے بھی تھوڑا بہت پڑھانا شروع کر دیا' ابتدائی کتابیں وہ خود ہی خرید لایا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھنے

کا شوق مجھے ابتداء ہی سے تھا۔ اب ایک سہارا ملا تو میں نے اور دل جمعی سے اس طرف توجہ دینا شروع کر دی' اور اوقات مقرر کر دیئے گئے تھے' صبح کو ہم دونوں اخبارات بیچتے ہم نے اپنا دائرہ اور وسیع کر لیا تھا' اس کے بعد غیاث کالج چلا جاتا' میں گھر میں آکر تھوڑی دیر گھر کے کام کاج کرتا جو چیزیں بازار سے لانا ہوتیں لے کر آتا' کیونکہ ان کی زمہ داری میں نے اپنے سر قبول کر لی تھی' غیاث کو میں نے گھر کی تمام فکروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔



ان سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں دس ساڑھے دس بجے گھر سے باہر نکل جاتا اور پورے کراچی میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ میری خواہش تھی کہ مجھے کسی بھی جگہ کسی بھی قسم کی نوکری مل جائے' چنانچہ اس سلسلے میں گھومتے ہوئے مجھے تقریباً بیس دن گزر گئے تھے۔ تب ایک دن غیاث ہی نے مجھے اخبار کی کٹنگ دکھائی اور کہنے لگا۔

"سردار اگر تم چاہو تو یہ نوکری تمہارے لئے بہترین ہوگی۔ سردار بھیا۔"

"کیا ہے یہ....؟" میں نے غیاث کے ہاتھ میں اخبار کا تراشا دیکھ کر پوچھا۔

"ایک ایسی نوکری ہے جس میں تمہیں صبح دس بجے سے لے کر شام کے چار بجے تک مصروف رہنا پڑے گا' چار سو روپے ماہوار تنخواہ ہے' دوپہر کا کھانا بھی مفت غرض کے تم یہ نوکری آرام سے کر سکتے ہو۔"

"کام کیا کرنا ہوگا غیاث۔؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک اسٹور ہے' اس میں موجود شے کی نگرانی' انہیں اٹھالے جانا' ایسے ہی اوپر کے کام ہیں' جنہیں تم جیسا آدمی آرام سے کر سکتا ہے۔" غیاث نے کہا' اور میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

"پھر غیاث تم مجھے فوراً وہاں لے چلو۔ بہت ہی اچھی بات ہے یہ تو' لطف آ جائے گا۔" میں نے کہا اور غیاث نے گردن ہلادی۔

ہم نے اس مسئلے میں زیادہ دیر نہیں کی' دوسرے ہی دن ہم اسٹور پہنچ گئے' ڈیپارٹمینٹل اسٹور تھا' دنیا بھر کی اشیاء سجی ہوئی تھیں' کام صرف یہ تھا کہ ان اشیاء کی نگرانی کی جائے اور گاہکوں پر نگاہ رکھی جائے' جس شخص کو جس چیز کی ضرورت ہو وہ اسے فراہم کر دی جائے۔ دو آدمی اس کام کے لئے متعین تھے۔ اور کچھ آدمی وہ نوکر اور رکھنا چاہ رہے تھے۔ اسٹور صبح دس بجے کھلتا تھا' کھلنے کے بعد اس کی تھوڑی بہت صفائی کرنا ہوتی تھی اور اس کے بعد شام کے چار بجے تک یہ ڈیوٹی تھی' چار بجے دوسرا آدمی کام کے لئے آ جایا کرتا تھا' اور پھر وہ رات کے بارہ بجے تک کام کرتا تھا' میں نے اسٹور کے مالک جن کا نام حاجی احمد علی تھا سے بات کی اور انہیں یقین دلایا کہ میں پوری دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض انجام دوں گا' چنانچہ مجھے رکھ لیا گیا اور دوسرے دن سے میں نے اسٹور جانا شروع کر دیا' اسٹور کی نوکری میرے تجربے میں اضافے کا باعث تھی' یہاں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی' صبح سے شام تک وہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور میں پیسے کی فراوانی دیکھ کر حیران ہوتا جا رہا تھا' وہ چیزیں خریدی جاتیں تھیں جن کا عام زندگی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ بس تفریحاً ہی انہیں خریدا جا سکتا تھا۔ بھاری رقومات خرچ کرکے بیگمات اور ان کے ساتھ موجود صاحب یہ چیزیں خریدا کرتے تھے۔ اور خوش خوش واپس چلے جایا کرتے تھے۔

کچھ دن تک تو میں حیرت کا شکار رہا' پھر آہستہ آہستہ سارا ماحول میری سمجھ میں آتا گیا' یہاں کچھ لوگ اتنے دولت مند تھے کہ ان کی نگاہوں میں پیسے کی کوئی حقیقت نہیں تھی اور کچھ ایسے تھے جو پیٹ بھرنے کے لئے بھی ترستے تھے' عجیب تضاد تھا زندگی میں ہر

شخص مختلف حیثیت کا مالک' آہستہ آہستہ یہ ماحول میرے ذہن میں اترتا جا رہا تھا اور میں زندگی کی ان حقیقتوں سے روشناس ہوتا جا رہا تھا جن کے بارے میں مجھے پہلے معلومات نہیں تھیں!

میں سوچتا تھا کہ میں ان لوگوں میں کبھی شامل نہیں ہو سکتا جو لمبی لمبی حسین کاروں میں بیٹھ کر آتے ہیں جو اعلیٰ ملبوسات میں ملبوس' اونچے جوڑے اور خوبصورت کپڑے پہنے بیگمات کے ساتھ آتے ہیں' اور اپنی امارات کے مظاہرے کرکے چلے جاتے ہیں۔ میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں اور معمولی ہی رہوں گا!

یہاں مجھے مہینے کی پہلی تنخواہ چار سو روپے ملی اور میں نے وہ بھی لے جا کر امی کے قدموں میں ڈال دی' تب انہوں نے نہایت دیانت اور خلوص سے وہ سو روپے نکال کر مجھے دیے جو جمع رکھے تھے۔ اور کہنے لگیں۔

"بیٹے اب یہ پانچ سو روپے تم گھر بھجوا دو!"

"نہیں امی ابھی تو ہمیں ان کی یہاں ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس کپڑے موجود ہیں اور پھر اس مہینے اخبار کے بل وصول کرنے کے بعد جو سو روپے بچیں ان میں سے تم کپڑے بنوا لینا۔ آئندہ مہینے ہم گھر کچھ نہیں بھیجیں گے' لیکن اس کے بعد تیسرے مہینے ہم تقریباً سات سو روپے گھر بھجوا دیں گے' تاکہ ان کا بھی کام چل جائے' تم نے بتایا ہے نا تمہاری بہنیں بھی ہیں اور تمہیں ان کی شادی کرنی ہے۔" انہوں نے کہا۔" اور میں نیکی کے مجسمے کو دیکھتا رہ گیا۔

مہربان عورت کی اس گفتگو سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ مجھے اپنے گھر کے لوگ یاد آ گئے' میں نے ابھی تک یہاں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ابتداء میں جو کچھ ملا تھا وہ بھیج دیا تھا' بعد میں امی کے کہنے پر میں نے یہ پیسے غیاث کو دے دیئے اور غیاث ان کا منی آرڈر کر آیا۔ پھر جب مجھے منی آرڈر کی رسید ملی تو اس کے ساتھ ہی اپنے والد کا خط بھی ملا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ میں نے طویل عرصے سے انہیں اپنی خیریت سے مطلع نہیں کیا۔

ان لوگوں کی خیریت معلوم کرکے مجھے بے حد سکون ملا' ایک دفعہ تو دل چاہا کہ جا کر انہیں دیکھ آؤں مل آؤں' لیکن اسٹور کی نوکری ابھی بالکل نئی تھی' چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' چنانچہ دل مسوس کر رہ گیا' اور اس کے بعد باقاعدہ خط و کتابت جاری ہوگئی۔



میرے والد اکثر مجھے لکھتے تھے کہ وہ بہت عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں میری بھیجی ہوئی رقومات سے انہوں نے بڑے بڑے کام کر لئے ہیں' بہنوں کے لئے کچھ ایسا سامان خرید لیا گیا ہے جن سے ان کی شادی میں مدد ملے گی' والد صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ بہنوں کے لئے رشتوں کی تلاش جاری ہے' یہ بھی لکھا تھا کہ جس قدر ممکن ہو سکے میں بہنوں کا جہیز جمع کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم بھیجوں.... اور میں نے انہیں جواب میں لکھ دیا تھا کہ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں!

لیکن اب میری یہ کوشش محدود تھی' آمدنی کچھ اور بڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے دس بجے تک کی فرصت تھی' غیاث کو تو میں نے تقریباً پڑھنے کے لئے آزاد ہی چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ وہ سخت شرمندہ تھا اور کہتا تھا کہ میں زیادہ محنت کرتا ہوں۔ اور معاوضے میں وہ شریک ہو جاتا ہے' میں نے اس کی بات کا برا مان کر اسے خاموش کر دیا تھا' میں نے اس سے کہا تھا کہ غیاث میں تمہارا بڑا بھائی ہوں.... اور اگر تمہارا بڑا بھائی ہوتا تو کیا وہ تمہیں کچھ کرنے دیتا۔؟ کم از کم اتنی مدد تو مجھ سے بھی حاصل کرلو کہ اپنی

پڑھائی پر پوری توجہ دو اور یہ چھوٹے موٹے کام مجھے کر لینے دو!

بہر صورت گھر کا نظام بہتر طور پر چل رہا تھا۔ یوں چند ماہ اور گزر گئے۔ بظاہر زندگی پر سکون تھی' لیکن میں نے ایک بات کہی تھی نا۔ کراچی کی زندگی میں سکون کہاں۔؟"

اب میں کراچی شہر کے کافی حصوں سے واقف ہو گیا تھا' چھٹی کے دن اکثر گھومنے پھرنے نکل جاتا تھا' غیاث نے میرے لئے بھی ایک سائیکل خرید دی تھی اور ہم دونوں سائیکل پر نجانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے تھے' لیکن یہ پروگرام صرف چھٹی کے دن کا ہوا کرتا تھا اس کے علاوہ غیاث بدستور مجھے پڑھا رہا تھا۔ اب میں اردو بہت اچھی طرح لکھنے اور پڑھنے لگا تھا بلکہ تھوڑی بہت انگریزی میں بھی شد بد ہو گئی تھی۔

میرا حلیہ بدلتا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا مستقبل میرا راستہ تک رہا ہو' ایک بہتر مستقبل جس میں شاید بہتر زندگی بھی نصیب ہو جائے۔

میں اور غیاث اکثر مختلف پروگرام بنایا کرتے تھے' غیاث کا خیال تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کسی دفتر میں نوکری کرے گا' بلکہ کاروبار شروع کرے گا جس میں میں اس کا ساتھ دے سکوں' وہ میری شمولیت سے بے حد خوش رہتا تھا۔ لیکن یہ خوشی ہم دونوں کو راس نہ آئی

دو طویل القامت شخص بہترین لباسوں میں ملبوس اندر داخل ہوئے ان میں سے ایک نے سگریٹ طلب کی اور وہیں پیکٹ کھول کر سگریٹ سلگانے لگا' دفعتاً" اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ ایک دم اس طرح اچھل پڑا جیسے اس نے کسی خوفناک چیز کو دیکھ لیا ہو۔

چند ساعت وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کی طرف جھک کر کچھ کہا۔ اس کا ساتھی بھی میری جانب دیکھنے لگا تھا' دونوں کے چہرے ایسے نظر آنے لگے جیسے ان کی حالت بہت خراب ہو گئی ہو۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گئے' لیکن مجھے حیرت تھی۔

ان لوگوں کی مجھے دیکھ کر یہ حالت کیوں ہوئی تھی' کیا ان کا تعلق رمضان سے تو نہیں۔ میں نے سوچا' رمضان سے میری اس دن کے بعد سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نا ہی میں نے اس طرف کا رخ کیا تھا' میری زندگی محدود سی تھی ایک مختصر سے راستے سے جانا اور وہیں سے آنا' ہاں چھٹی کا دن البتہ غیاث کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر کو ضرور چلا جاتا تھا' وہ لوگ میرے ذہن میں اٹکے رہے' شام کو چار بجے جب میری اسٹور سے چھٹی ہوئی تب بھی میرا ذہن انہی میں اٹکا رہا تھا کہ کون لوگ تھے آخر' مجھے دیکھ کر کیوں چونک پڑے ہیں ہمیشہ کی طرح آہستہ روی سے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا اور

ابھی میں بس اسٹاپ کے نزدیک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اچانک ایک خوبصورت لمبی کار میرے نزدیک رک گئی' ان میں سے ایک آدمی نے گردن نکال کر باہر جھانکا۔ اور مجھے مخاطب کیا۔ میں ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگا تھا.... پھر میں دوبارہ چونک پڑا۔

یہ وہی دونوں تھے جو اسٹور میں آئے تھے' میں خوفزدہ ہوگیا تھا لیکن بظاہر بہادر بنا رہا' تب ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

معاف کرنا بھائی صاحب ہمیں آپ سے ایک کام ہے.... اور میں ان کے قریب پہنچ گیا۔

"جی فرمایئے !"

"کیا آپ ہمیں کچھ وقت دے سکیں گے!؟"

"وقت.... لیکن کیوں؟"

"ہمیں آپ سے کچھ کام ہے!"

"کیا کام ہے آپ کو مجھ سے۔" میں نے کریدنے والی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔؟"

"بس ایک غلط فہمی ہے جسے ہم دور کرنا چاہتے ہیں!"

"غلط فہمی' کیا غلط فہمی ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے آج دن میں آپ کو ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں دیکھا تھا اور حیران رہ گئے تھے!"

"ہاں مجھے معلوم ہے' آپ لوگ آئے تھے اور شاید آپ نے سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا اور مجھے دیکھ کر چونک پڑے تھے۔"

"ظاہر ہے.... میں آپ لوگوں کو پہلے سے نہیں جانتا اس لئے آپ کی اس حرکت پر مجھے حیرت ہوئی تھی!"

"بہرصورت ہمیں آپ سے صرف گفتگو کرنی ہے' براہ کرم پندرہ منٹ آپ ہمیں دے دیں' اس کے بعد جہاں آپ کہیں گے آپ کو چھوڑ دیں گے۔"

"یہیں بات کرلیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"اوہ' کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں' ایک دوستانہ گفتگو ہوگی۔" اور چند لمحات کے بعد ہم آپ کو رخصت کر دیں گے' بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ ایک پیالی چائے ہمارے ہی ساتھ پئیں!"

بات نہایت شریفانہ انداز میں کی جاری تھی' یوں بھی چہرے مہرے سے کوئی خاص اندازہ نہیں ہوتا تھا' وہ لوگ خاصے خوش لباس اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے' چنانچہ

"اس سے قبل کہاں تھے؟"

وہ برابر سوالات کئے جا رہے تھے' اور ان کے ان مسلسل سوالوں سے میں کسی قدر جھنجھلا گیا' اور تیز لہجے میں بولا۔

"یہ ساری باتیں میں بعد میں بتاؤں گا' پہلے آپ لوگ اپنا مقصد بتائیں' یہ سوالات مجھ سے کیوں کئے جا رہے ہیں۔؟"

"تمہارا مستقبل بنانے کے لئے۔" وہی شخص بولا جو مجھ سے مسلسل سوالات پوچھے جا رہا تھا۔

"کیا مطلب ہوا اس بات کا؟"

"مستقبل ایک ایسی چیز ہے جسے ہر انسان بہتر سے بہتر دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور ہر شخص کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے مستقبل میں پھول ہی پھول کھل جائیں۔ کیا تم یہ بات پسند نہیں کرو گے کہ تمہاری آئندہ زندگی اسٹورز کے ایک سیلز مین یا نگراں کی حیثیت کی بجائے ایک بہت بڑے آدمی کی حیثیت سے گزرے۔"

"یقیناً پسند کروں گا' لیکن تم اس سلسلے میں کیا کہنا چاہتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ہم تمہیں وہی زندگی فراہم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ دوست اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہاری صورت ایک ایسے شخص سے مشابہہ ہے جو بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے' اگر تم اپنی صورت سے فائدہ اٹھانا چاہو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

"دیکھو بھائیو میں تمہیں ایک بات بتادوں' میں ایک غریب سا آدمی ہوں بلکہ باالفاظ دیگر تم مجھے دیہاتی کہہ سکتے ہو۔ اپنی بستی سے کراچی اس لئے آیا تھا کہ یہاں سے کچھ کما کر اپنے گھر بھیج سکوں' لیکن کراچی کے ہنگاموں میں میں حالات کا شکار ہوگیا اور وہ سب کچھ نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا' تاہم ایک بار پھر میری زندگی ان بہتر راستوں پر چل پڑی ہے جن پر چل کر میں اپنے مقاصد پورے کر سکتا ہوں' بڑا آدمی بننے کی خواہش کسے نہیں ہوتی' جس وقت میں کراچی آیا تھا تو کچھ اور لوگوں نے بھی مجھے بڑا آدمی بنانے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن اس کے بعد مجھے تین ماہ جیل میں گزارنا پڑے' چنانچہ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس کی کوئی قانونی پکڑ ہو' میں شرافت سے جو کچھ کر رہا ہوں اس میں مگن رہنے کا خواہش مند ہوں!"

"بالکل ٹھیک ہے! لیکن اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تم جو کام کر رہے ہو وہ کسی طور پر تمہارے لئے نہ تو نقصان دہ ہے اور نہ ہی تمہارے ضمیر پر بوجھ ہو' اور اس کے بعد

میں نے بھی سوچا کہ اس طرح کسی کی دعوت پر انکار کرنا بزدلی کی علامت ہے' اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ' چنانچہ میں نے گردن ہلادی اور ان میں سے ایک نے جلدی سے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔

میں زندگی میں پہلی بار اتنی عمدہ اور بڑی کار میں بیٹھا تھا' بہرصورت بیٹھنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ کرنے والے نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

راستے میں میں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کی تھی' تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوشنما بنگلے کے مین پھاٹک سے اندر داخل ہوگئی' خوبصورت سی کوٹھی تھی جس کے باہر قیصر ولا کا بورڈ لگا ہوا تھا۔



میں نے کوٹھی اندر سے دیکھی تو حیران رہ گیا' آج تک یہ خوبصورت بلند و بالا عمارتیں باہر سے دیکھی تھیں۔ اندر کے بارے میں اندازہ نہیں کیا تھا کہ وہ اندر سے کیسی ہوں گی' اس حسین کوٹھی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ امارت کا کیا کیا مظاہرہ نہیں تھا اس کوٹھی میں' اندرونی داخلے کے بعد سیڑھیوں میں قالین بچھا ہوا تھا اور یہی قالین بچھی ہوئی سیڑھیاں اوپر تک جاتی تھیں۔ نیچے ایک بڑا ہال تھا جس میں صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور نہایت قیمتی اشیاء سے سجاوٹ کی گئی تھی' لیکن وہ لوگ نیچے رکنے کی بجائے مجھے اوپر لے گئے۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ ضرور تھی ذہن میں، کیونکہ اس سے پہلے اتنے قیمتی مکان میں نہیں آیا تھا، اس کے علاوہ یہ لوگ بھی میرے لئے اجنبی تھے۔ تاہم میں نے اس ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا اور اوپر پہنچ گیا۔

سیڑھیوں کے بعد ایک دروازے کے دوسری جانب ایک بہت بڑا کمرہ تھا، یہ کمرہ بھی ہال نما تھا اور نیچے والے ہال سے مطابقت رکھتا تھا یعنی اس قسم کی سجاوٹ سے مزین تھا، ان دونوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں جھجکتا ہوا سا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا دوست؟" ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

"سردار علی!"

"خوب، کہاں رہتے ہو؟"

"جیکب لائن میں۔"

"اس اسٹور میں کب سے ملازمت کرتے ہو؟"

"چند ماہ سے!"

"تمہیں بہتر زندگی کے مواقع مل رہے ہوں تو کیا تم انہیں ٹھکرا دو گے؟"

"تمہارا مقصد کیا ہے، پہلے تم مجھے اپنا مقصد بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"ہم لوگ نہایت شریفانہ ماحول میں شریفانہ انداز کی گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں دوستوں کی طرح سارے مسائل پر غور کر لینا چاہئے.... ہم نے تمہیں دیکھا اور اگر تم اس صورت سے ملتے جلتے ہوئے نہ ہوتے تو شاید ہم تمہاری طرف توجہ بھی نہ دیتے، بہر صورت تمہیں پوری بات بتا دی جائے گی، اس کے بعد تم فیصلہ کر لینا کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہو یا نہیں، اگر تم نے انکار کیا تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے!"

"تب ٹھیک ہے، بہت بہت شکریہ، اب آپ لوگ مجھے بتائیں کہ مجھے آپ کے لئے کیا کرنا ہے۔؟"

"ایک منٹ۔" وہ شخص بولا، پھر دوسرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "بھئی کچھ چائے وائے کا بندوبست نہیں کرو گے، اب اتنی بداخلاقی بھی کس کام کی، جو کچھ بھی ہیں ہمارے دوست ہیں، اگر یہ ہمارے ساتھ تعاون پر آمادہ نہیں بھی ہوتے، تب بھی ہم انہیں پیشکش کریں گے کہ ہمارے دوست رہیں، جاؤ ہلکے پھلکے ناشتے کا بندوبست کرو۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے جناب، بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ کام کی گفتگو کریں، اس کے بعد مجھے جانا بھی ہے۔"

"نہیں سردار.... اس انداز میں پیش مت آؤ۔ میں نے کہا تاہم دوستانہ انداز میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔" اس نے دوسرے آدمی کو اشارہ کیا' اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"ویسے تم نے ہم لوگوں کے نام نہیں پوچھے؟"

"منتظر تھا کہ تم لوگ خود ہی اپنا نام بتا دو۔"

"میرا نام شیراز ہے اور میرا دوست محمود!"

"بہت خوب۔ بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر!"

"ویسے تم کچھ پڑھے لکھے ہو سردار۔؟"

"بالکل نہیں۔ بس یوں سمجھیں کہ دیہات سے آنے کے بعد کراچی میں رہا۔ پھر کچھ ایسے کرم فرما مل گئے جنہوں نے زندگی گزارنے میں مجھے بڑی مدد دی' انہی میں سے ایک شخص نے مجھے تھوڑا بہت پڑھانا بھی شروع کر دیا' اب اردو وغیرہ پڑھ لکھ لیتا ہوں' تھوڑی بہت انگلش کی سد بد بھی ہے.... لیکن پڑھا لکھا نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے' اپنا کام تو چلا رہے ہو' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شیراز نے کہا۔

وہ بڑے نرم اور میٹھے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ چند ساعت کے بعد یہ احساس میرے ذہن سے نکل گیا کہ یہ شخص میرے لئے اجنبی ہے' اور کسی غلط انداز سے مجھے یہاں لایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد محمود بھی واپس آ گیا اور ہماری گفتگو میں شریک ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم ایک خوبصورت ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر سے آیا.... ٹرالی پر نفیس برتنوں میں چائے سجی ہوئی تھی' اس کے علاوہ کچھ پھل اور ڈرائی فروٹ بھی تھا۔ ملازم نے بڑے ادب سے پلیٹیں ہمارے طرف سرکائیں' پھر چائے بنانے لگا!

چائے بنا کر اس نے ایک پیالی میرے سامنے رکھ دی اور ایک ایک ان دونوں کو دے دی' ہم لوگوں نے اپنی اپنی پیالیاں اٹھالی تھیں۔ پھر ہم لوگ چائے سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگے مجھے ڈرائی فروٹ میں' سے کچھ لینے کے لئے کہا گیا' میں نے "بے تکلفا" ان میں سے چند چیزیں اٹھائیں اور شغل کرنے لگا! اس کے ساتھ میں چائے بھی پی رہا تھا۔

"ہاں تو سردار تم ہمارے لئے اتنی بڑی حیثیت رکھتے ہو کہ ہم بیان نہیں کر سکتے' بلکہ یوں سمجھو کہ تم ایک طرح سے ہماری مشکلات کا حل بھی ہو!"

"مگر کس طرح.... مجھے تعجب ہے کہ مجھ جیسا شخص بھی کسی کے کام آ سکتا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں دوست بعض اوقات مطلوبہ چیزیں ایسی ہی جگہ مل جاتی ہیں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' شیراز نے محمود کی طرف دیکھ کر کہا اور محمود مسکرانے لگا!

"ہاں یہ درست ہے' میں نے بھی ان کی بات میں شامل ہونے کی غرض سے کہا اور چائے کا آخری سپ لے کر پیالی ٹرالی پر رکھ دی.... لیکن پیالی رکھتے ہی میرا ہاتھ اچانک لرز اٹھا تھا اور پھر مجھے اپنے سر میں شدید چکر محسوس ہوا اور پھر یہ چکر بڑھتے چلے گئے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سر زور سے جھٹکا' لیکن یہ جھٹکا بھی عجیب ہی تھا۔ یوں لگا تھا جیسے دماغ کھوپڑی سے نکل کر کہیں دور جا پڑا ہو۔ سارا دماغ خالی خالی محسوس ہو رہا تھا.... اور پھر آخری احساس یہ تھا کہ میں ایک طرف گر رہا ہوں' اس کے بعد کوئی اور احساس نہ رہا.... یہاں سے میری زندگی کے دوسرے رخ کا آغاز ہوا تھا۔

اس بے ہوشی کے بعد جب میری آنکھ کھلی اور احساس جاگا تو میں نے اپنے بدن کے نیچے ایک نرم بستر محسوس کیا' جس کمرے میں' میں نے آنکھ کھولی یہ وہ نہیں تھا جہاں میں بے ہوش ہوا تھا' بڑی بدلی ہوئی کیفیات کا حامل' دیواروں پر خوبصورت رنگ اور جگہ جگہ حسین تصاویر' بستر کے بالکل سامنے ایک پر رعب اور معمر شخص کی تصویر ایک چوڑے فریم میں لگی ہوئی تھی۔

کمرے کا ماحول بہت خوبصورت تھا' روشنی نہایت ہلکی' چند ساعت تو میں اس ماحول کا جائزہ لیتا رہا' پھر جب احساس پوری طرح جاگ اٹھا تو میں گھبرائے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھ ٹیک کر اٹھ گیا ہاتھ ٹیکنے سے میرے دونوں ہاتھ گدے میں دھنس گئے تھے' بڑا نرم اور بڑا ہی نفیس گدا تھا!

میں نے دہشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پلنگ سے نیچے کود گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے بدن پر جو لباس ہے وہ بھی میرا اپنا نہیں ہے۔

سلک کا ایک خوبصورت سلیپنگ سوٹ تھا۔ جو میرے بدن پر تھا' میں نے تحیرانہ انداز میں سوٹ دیکھا اور پھر اپنے لباس کے لئے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن لباس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھا' نجانے میں کون سے طلسم میں آ گیا تھا' وہ دونوں نوجوان نجانے کہاں چلے گئے تھے' اور نجانے ان کا مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا' لیکن۔ لیکن.... میرا ذہن چکرانے لگا' کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' تب میں نے اس کمرے کا دروازہ تلاش کی تو وہ باہر سے بند ملا' میں نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا' دروازہ کھلنے میں دیر نہ لگی' جو صورت میرے سامنے آئی چونکا دینے والی تھی۔

شانوں سے لے کر پیر کے ٹخنوں تک سرخ میکسی میں ملبوس دلآویز مسکراہٹ تھی' ایسی مسکراہٹ جو کسی کا دل لوٹ لے۔



"ہیلو ہارون۔" اس نے نرگمیں آواز میں پوچھا اور میں سراسیمہ سا اس کی شکل دیکھنے لگا!

"پریشان کیوں ہو ہارون' کیا بات ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے سوال کیا' تب میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور گلا صاف کرکے بولا۔

"خاتون.... کچھ.... کچھ.... غلط فہمی ہوگئی ہے آپ کو میرا نام ہارون نہیں ہے....!

"میں باہر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چلے جانا ہارون' اندر تو چلو۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے افسردہ ہوگئی ہو!

"میں نے عرض کیا نا خاتون' میرا نام ہارون نہیں سردار ہے۔"

"اچھا اچھا جو تم کہہ رہے ہو وہی ٹھیک ہوگا لیکن اندر تو چلو۔ باہر کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ہر قیمت پر باہر جانا چاہتا ہوں!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اور لڑکی کے چہرے پر ایک تغیر نمایاں ہوگیا' اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔

"اچھا آؤ...." اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی' میں نے باہر نکل کر اس طویل راہداری کو دیکھا جس کے دونوں سمت دیواریں تھیں اور ان دیواروں پر انتہائی خوبصورت نقوش کندہ تھے فرش پر اتنا موٹا قالین بچھا ہوا تھا کہ اس میں پاؤں دھنسے جاتے تھے' لڑکی میرے آگے آگے چل رہی تھی' اس کی چال بے حد خوبصورت تھی' اس کے حسن سے میں کچھ مرعوب سا ہو گیا تھا' اس راہداری کا اختتام ایک اور دروازے پر ہوا....

لڑکی اس دروازے سے گزر گئی' میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ ہے' اور اس کمرے میں چار آدمی ایک میز کے گرد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے' انہوں نے گردن اٹھا کر ہمیں دیکھا' اور پھر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے ہارون صاحب جاگ گئے۔" ان میں سے ایک نے کسی قدر پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں! لیکن طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ کیا بات ہے!"

"بس وہی۔ کہہ رہے تھے میں ہارون نہیں ہوں...." لڑکی نے جواب دیا۔

"اوہ.... ڈاکٹر کو بلاؤں....؟" اسی شخص نے سوال کیا۔

"جیسا تم پسند کرو۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہوں گے۔" لڑکی نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں میں جاتا ہوں!"

"سنو...." میں نے اس شخص کو مخاطب کیا' اور وہ رک گیا۔ "کہاں جا رہے ہو!" میں بھاری لہجے میں پوچھا۔

"وہ کچھ نہیں ہارون صاحب! ابھی آیا۔"

"رک جاؤ.... تم لوگ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو' میں بتا چکا ہوں میرا نام ہارون نہیں سردار ہے.... اور سنو اگر تم نے میری بات نہ سنی تو پھر جو کچھ ہوگا اس کے ذمہ دار تم خود ہوگے!"

"بہتر ہے ہارون صاحب' بہتر ہے لیکن میں ابھی واپس آجاؤں گا بس صرف چند لمحات کے لئے!"

"پہلے میری پوری بات سن لو' میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تم لوگ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو' میرا نام ہارون نہیں سردار ہے' اور میں جیکب لائن کی ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں کچھ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے' وہاں انہوں نے ایک بنگلے میں میری خاطر مدارت کی اور میں بے ہوش ہوگیا' اس کے بعد میری آنکھ یہاں کھلی ہے' میری خواہش ہے کہ تم اپنی غلط فہمی کا ازالہ کرلو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔" میری آواز میں کافی سختی تھی' وہ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر وہ لڑکی میرے نزدیک پہنچ گئی اور میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اگر آپ کا نام سردار ہے تو کوئی ہرج نہیں ہے' آیئے ہمارے ساتھ دوسرے کمرے میں چلئے' کچھ باتیں کریں گے' اور اپنی غلط فہمی دور کریں گے' اس کے بعد جہاں آپ کہیں گے وہیں آپ کو پہنچا دیا جائے گا!"

میں نے لڑکی کے چہرے کی جانب دیکھا' یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کے سب جھوٹ بول رہے ہوں! اور کسی خاص وجہ سے مجھے بیوقوف بنانے پر تلے ہوئے ہوں! لیکن میں ان کے درمیان تا' میرے بدن پر میرا اپنا لباس بھی نہیں تھا' چنانچہ میں نے سوچا مصلحت سے کام لینا چاہئے' نجانے ان لوگوں کا مقصد کیا ہے.... کراچی میں رہتے ہوئے خاصا وقت گزر گیا تھا' اور اب میں اہل کراچی سے تھوڑا تھوڑا واقف بھی ہوگیا تھا' چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموشی اور نرمی سے ہی اپنا کام نکالا جائے' ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا.... چنانچہ میں نے گردن ہلادی۔

لڑکی اس بار اس کمرے میں بنے ہوئے ایک اور دروازے کی جانب بڑھی تھی اور اس کے بعد وہ میرے ساتھ ایک اور راہداری سے گزر کر ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔

عجیب سی عمارت تھی' ہر جگہ قالین بچھے ہوئے تھے' اتنی خوبصورت عمارت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

یہ دوسرا کمرہ بھی انتہائی حسین چیزوں سے آراستہ تھا۔ جن کا ذکر کرنا اب فضول ہی

ہے' یہاں ایک صوفہ سیٹ بھی پڑا ہوا تھا' لڑکی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود اس انداز میں ایک سمت بڑھی جیسے بیٹھنے جا رہی ہو' لیکن دوسرے لمحے غڑاپ سے باہر نکل گئی تھی اور ایک بار پھر دروازہ بند ہوگیا۔

میں اچھل کر کھڑا ہوگیا اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا لیکن اس بار دروازہ نہیں کھلا تھا' سراسیمہ اور پریشان سا میں کمرے کے چاروں طرف دیکھنے لگا' یا اللہ یہ نیا چکر کیا چل گیا' اس بار اگر پھنسا تو کسی بہت بڑی مصیبت میں ہی پھنسوں گا' میں سوچ رہا تھا۔

دروازہ پیٹتے ہوئے کافی دیر گزر گئی لیکن کوئی جواب نہ ملا.... میں تھک ہار کے دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا.... کیا کروں' کس طرح اس جنجال سے اپنی جان بچاؤں' یہ لوگ کون ہیں' کیا چاہتے ہیں' کیا یہ لوگ واقعی کسی غلط فہمی کا شکار ہیں' یا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ پھر مجھے دروازہ کھلنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

اس بار جو لوگ اندر آئے وہ عمدہ قسم کا سوٹ پہنے ہوئے تھے' وہ لڑکی بھی ان کے ساتھ تھی' سب سے آگے ایک طویل القامت شخص تھا جس کے بال بالکل سفید تھے' لیکن چہرہ صحت مند نظر آرہا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا' اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں بڑی شفقت چسپاں تھی' میں چونک کر کھڑا ہوگیا۔

بیٹھو تو سہی ضد نہ کرو' بیٹھ جاؤ۔" طویل القامت شخص نے میرا بازو پکڑ لیا' اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ہاتھ خاصہ سخت ہے۔ اس نے مجھے کسی قدر طاقت صرف کرکے نیچے بٹھا دیا تھا اور پھر وہ میرے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"آخر کیوں....؟" "کیا بیماری ہے مجھے؟"

"کچھ نہیں بیٹے کچھ نہیں' دیکھو جو کہا جا رہا ہے کرو' ہم تمہارے دوست ہیں۔ دشمن نہیں۔"

"محترم مجھے دوستوں کی ضرورت نہیں' میں نہیں جانتا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے کتنا وقت گزر گیا' میں ایک ملازمت پیشہ آدمی ہوں' اور اگر اپنے گھر نہ پہنچا تو نا صرف یہ کہ میری ماں بہن اور بھائی پریشان ہوں گے بلکہ میری ملازمت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"ملازمت' کیا بات کرتے ہو ہارون' تم تو خود ایک بہت بڑی شخصیت ہو تم تو خود

دس ملازم رکھ سکتے ہو۔" اس شخص نے کہا۔

"بس یہی غلط فہمی ہے آپ کو..... میں ان سب کو بتا چکا ہوں کہ میرا نام ہارون نہیں سردار ہے۔" میں نے کہا اور وہ شخص دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا! تب ان میں سے ایک اور شخص نے جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور تھوڑی پر ایک بڑا مسہ تھا آگے بڑھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے صاف بات کر لینا مناسب ہوگا' بجائے اس کے کہ اسے پریشان کیا جائے' صاف صاف بات کیوں نہ کر لی جائے!"

"جیسی تمہاری مرضی...." سفید بالوں والے نے شانے ہلائے اور صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

وہ شخص میرے سامنے آگیا تھا' پھر وہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔" دوست ہم بھی جانتے ہیں کہ تمہارا نام سردار ہے' لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم خود کو سردار سمجھنا چھوڑ دو' اور ہارون کہنا شروع کر دو۔"

"کیوں کیا میں پاگل ہوگیا ہوں یا تم سب پاگل ہو۔!"

"نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہم دونوں میں سے بلکہ ہم سب میں سے کوئی پاگل نہیں ہے' تمہاری صورت سردار ایک ایسے شخص سے ملتی ہے جس کا نام ہارون ہے اور وہ شخص ہمارے لئے اتنی بڑی حیثیت رکھتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن افسوس اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہا' اور اس کی وجہ سے ایک ایسا شخص شدید صدمے کا شکار ہے جو ہارون سے شدید محبت کرتا ہے۔ یہ صدمہ اس کی جان بھی لے سکتا ہے' چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ تم تھوڑے عرصے کے لئے خود کو ہارون کہنا اور سمجھنا شروع کر دو' تم نے الف لیلوی کردار ابوالحسن کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ ایک رات وہ سویا تو خلیفہ ہارون الرشید بن گیا' اور ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ تم ہارون الرشید نہ سہی ہارون بن جاؤ۔" مونچھوں والا شخص مسکرایا اور میں پریشانی سے اس کی صورت دیکھنے لگا...." یقین کرو اگر یہ ایک شخص کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو ہم تمہیں اس مصیبت کا شکار نہ بناتے۔ باقی رہی تمہاری ملازمت کی بات' اور تمہاری ماں بہن بھائی کا مسئلہ..... تو تم بھروسہ کرو کہ اگر تم ہمارے کام آؤ گے تو انہیں ہماری زندگی میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی' اتنا کچھ دے دیا جائے گا کہ تم پریشانیوں سے نکل جاؤ گے' اپنا کوئی کاروبار کر لینا اور اس کے بعد سکون کی زندگی بسر کرنا..... اگر کسی نیک کام کے لئے تمہاری خدمات حاصل کی جا رہی

ہیں تو تم ایک اچھے انسان کی حیثیت سے ہماری مدد کرو۔"

میں سوچ میں ڈوب گیا' جو کچھ وہ کہہ رہے تھے اگر درست تھا تو واقعی سوچنے کی بات تھی' لیکن یہ ساری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں' رہ رہ کر ایک ہی خیال ذہن میں ابھرتا تھا کہ کہیں یہ بھی کوئی چال نہ ہو' یہ لوگ مجھے کسی مصیبت کا شکار نہ بنا دیں۔

"دوست جلدی مت کرو' ہماری پیشکش پر غور کرو اور اگر تم چاہو تو تمہاری طرف سے کوئی پیغام تمہارے گھر بھجوایا جا سکتا ہے' ہمارا وعدہ۔" مونچھوں والے شخص نے کہا۔ انداز میٹھا میٹھا اور نرم تھا' اور ایسی لجاجت تھی' اس لہجے میں کہ میں سخت رویہ چھوڑ بیٹھا' اور میں نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

"لیکن دیکھو تو سہی اس طرح مجھے یہاں لانا اچھی بات تو نہیں ہے وہ دونوں کون تھے جن کا نام شیراز اور محمود تھا۔ انہوں نے دھوکے سے مجھے بلایا اپنے گھر لے گئے اور پھر شاید چائے میں مجھے بے ہوشی کی کوئی دوا دے دی۔

ہاں اس بات پر ان دونوں کو سخت ڈانٹا گیا تھا' انہیں کہا گیا تھا کہ شریفانہ طور پر اس شریف آدمی سے بات کر لیتے' اگر سردار صاحب تیار ہو جاتے تو ٹھیک تھا ورنہ ہماری بدقسمتی' اب بھی سردار یہی بات ہے اگر تم خلوص دل سے ہمارے کام آنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ یقین کرو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے' ہاں ایک دعوت ضرور دیں گے کہ ایک نظر اس شخص کو دیکھ لو اس کی حالت کتنی خراب ہے' وہ نیم دیوانہ ہو گیا ہے اور ہمیں خطرہ ہے کہ اس دیوانگی کے عالم میں وہ کہیں چل نہ بسے' وہ اپنے بیٹے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے' اس کے بعد سردار اگر تمہارا دل گواہی دے تو تم تیار ہو جانا' ورنہ ہم تمہیں اس جگہ چھوڑ دیں گے' جہاں تم کہو گے!"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا' پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔" بہتر ہے' لیکن مجھے سوچنے کا موقع دو!"

"ضرور سردار ضرور..... لیکن تم جواب ہمیں کب تک دو گے؟"

"تھوڑی دیر کے بعد!" میں نے جواب دیا۔

کیا تم اس عرصے کے لئے اپنے گھر جانا چاہتے ہو۔؟"

"ہاں' بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے جانے کی اجازت دے دو' میں گھر والوں کو اس سلسلے میں بتا دوں گا!"

"نہیں سردار خدا کے لئے نہیں' اس طرح ہم اپنی ساری کوششوں میں ناکام ہو جائیں گے۔" مونچھوں والے شخص نے بدستور لجاجت سے کہا اور ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھنے لگا میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ گھر پر اطلاع بھجوا دیں اور واقعی جس پریشانی کا یہ اظہار کر رہے ہیں وہ سچ ہے تو کسی کے کام آنے میں کیا حرج ہے۔ رہا کسی غلط بات کا مسئلہ تو اس کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے' جب تک کہ کوئی الجھن پیش نہ آ جائے۔ چنانچہ میں نے اس بات پر آمادگی ظاہر کردی کہ میں ان کے درمیان رہنے کے لئے تیار ہوں' البتہ ابھی میں جواب نہیں دے سکتا۔

وہ سب اس کے لئے تیار ہوگئے تھے اور انہوں نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا' پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلے گئے' اور میں حالات پر غور کرنے لگا۔ یہ سارا ہنگامہ' کیا وہ سچ کہہ رہے ہیں اور اگر سچ نہیں کہہ رہے تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہیں!



میں اب دیہات کا سیدھا سادا نوجوان سردار نہیں رہا تھا۔ بلکہ کراچی میں' میں نے بہت کچھ دیکھا تھا' بہت کچھ سیکھا تھا اور اب اس کا مزاج کسی حد تک میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔

میرا ذہن ان سوالات کے جواب نہ تلاش کر سکا اور میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا' اپنی بستی عافیت کی بستی تھی اور جب عافیت کی بستی چھوڑ دی تو پھر کچھ بھی ہو سکتیں گے!

میں نے محسوس کیا تھا کہ ان لوگوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرلیا ہے' اب میں نے دروازے کو دوبارہ آزمانے کی کوشش نہیں کی تھی!

لیکن تھوڑی دیر کے بعد دروازہ خود ہی کھل گیا' وہ لڑکی اندر آ گئی جو میکسی پہنے ہوئے تھی' کافی خوبصورت لڑکی تھی اور اس لباس میں اور بھی حسین نظر آتی تھی' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میری آمد تمہیں ناگوار تو نہیں گزری سردار۔؟" اس نے میٹھی آواز میں پوچھا۔

"تمہارا گھر ہے' کسی بھی جگہ آ جا سکتی ہو' ناگواری کی کیا بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں.... تم ہمارے معزز مہمان ہو' تمہاری پسند یا ناپسند کا خیال رکھنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔"

"ان باتوں کو چھوڑو میم صاحب.... میری پسند ناپسند کی بات تو بڑی رسمی ہے۔"

"کیوں؟"

"ارے میں کون سا اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں!"

"وہ تو ٹھیک ہے! لیکن!"

"لیکن کیا۔ کہو؟" شیراز اور محمود تمہیں دیکھ کر اتنے بدحواس ہوئے کہ اخلاق و آداب بھول گئے۔ اب وہ دونوں بھی شرمندہ ہیں کیوں شرمندہ ہیں؟"

"ہم سب لوگوں نے انہیں ملامت کی ہے' خاص طور سے افضال نے تو انہیں بہت ڈانٹا ہے۔"

"افضال صاحب کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں' انہوں نے شیراز سے کہا کہ تمہیں اس طرح کیوں لایا گیا' ایک نیک کام تھا کوئی شریف آدمی فوراً تیار ہو جاتا' استدعا کیوں نہیں کی گئی۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو' اگر حرج نہ ہو تو میرے چند سوالات کا جواب دو!"

"ضرور.... ضرور' لیکن سردار' میرا خیال ہے ابھی تک تمہارا دل ہماری طرف سے صاف نہیں ہوا۔

"کیوں....؟"

"تم نے مجھ سے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔"

"اوہ بیٹھو میم صاحب' دراصل میں دیہاتی آدمی ہوں' شہری آداب سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوا ہوں!"

"یہ میم صاحب کیا ہوتا ہے؟" وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی!

"آپ کو کہہ رہا ہوں!"

"میرا نام فوزیہ ہے' اور آئندہ تم مجھے اس نام سے پکارو گے!"

"ٹھیک ہے!" میں نے گردن ہلا دی!

"کیا سوال پوچھ رہے تھے۔؟"

"صحیح جواب دو گی!"

"ہاں کیوں نہیں!"

"وعدہ؟"

"پکا وعدہ!"

"خدا جانے تمہارا یہ پکا وعدہ کس قسم کا ہو' بہرحال اگر وعدہ کر چکی ہو تو یہ بتا دو اصل چکر کیا ہے!"

"کیا مطلب۔"

"اصل چکر کا مطلب بالکل اصل چکر ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی!

"اصل چکر وہی ہے جو تمہیں بتایا گیا ہے!"

"یقین کر لوں....؟"

"آنے والا وقت بتا دے گا!"

"بات دراصل یہ ہے کہ میم صاحب۔ میرا مطلب ہے فوزیہ صاحب۔"

"فوزیہ صاحبہ.... اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں' ہاں' دراصل اس کراچی میں یہ خرابی بھی ہے' پتہ ہی ہیں چلتا کون صاحب ہے اور کون صاحبہ۔" میں نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔

"بہت کچھ سکھا دیا ہے تمہیں کراچی نے!"

"یہ تو سچی بات ہے' اپنی بستی میں بڑا سکون تھا' سیدھے سچے لوگ کوئی چھل فریب نہیں تھا' جس نے جو کچھ کہا سچ کہا' برا کہنا ہوا برا کہا اچھا کہنا ہوا اچھا کہا اور بات بن گئی' لیکن کراچی میں خدا کی پناہ۔"

"ہاں تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے' بہرصورت ہم لوگ تمہیں دھوکہ نہیں دے رہے۔ فوزیہ نے کہا۔

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ وہ شخص کون ہے جس کے لئے تم یہ سب کچھ کر رہے ہو۔"
؟"

"ایک بوڑھا انسان جو اپنے بیٹے سے اس وقت جدا ہوا جب وہ چوبیس سال کا کڑیل

جوان تھا' یہ داغ یہ زخم اس کے سینے پر ایسا چسپاں ہے کہ وہ مسکرانا بھول گیا' خدا نے سب کچھ دیا لیکن ہنسی چھین لی۔ ہاں بیٹے کی کی ایک نشانی تھی جس نے اس کی آغوش میں پرورش پائی' لیکن شاید چوبیسواں سال اس بوڑھے کے خاندان پر نحوست کا نشان ہے۔ چوبیسویں سال میں اچانک وہ نوجوان بھی ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ بوڑھے بدنصیب کے ساتھیوں اور دوستوں نے کسی طور اپنے اندر یہ ہمت نہیں پائی کہ اسے اس دوسرے صدمے کی اطلاع دیں' چنانچہ چند روز تک اسے لاعلم رکھا گیا اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے اسے دھوکے دیئے جاتے رہے' اس سے کہا گیا کہ اس کا پوتا سرکاری دلچسپیوں کی بنا پر باہر بھیج دیا گیا ہے' حکومت نے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے ایک خاص شعبے میں تربیت حاصل کرنے کے لئے باہر روانہ کر دیا گیا ہے۔

بوڑھا ضبط الحواس نہیں تھا' خاموش ضرور تھا' اسے یقین نہیں آیا' لیکن اسے یقین دلانے کے لئے طرح طرح کی کاروائیاں کی گئیں اور غمزدہ انسان آج تک اپنے نوجوان پوتے کا منتظر ہے' اس کا غم نہیں دیکھا جا سکتا' چنانچہ اس کے ہی خواہوں نے تگ و دو شروع کر دی۔

ہم لوگ انتہائی کوشش میں تھے کہ کسی طور کوئی ایسی سبیل پیدا ہو جائے جس کے تحت ہم اپنے جھوٹ کو برقرار رکھ سکیں' لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی' تمہیں یقین نہیں آئے گا سردار کہ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں' ہم لوگوں کو۔ باہر سے بوڑھے کے نام باقاعدہ خطوط آیا کرتے تھے' ہارون کی تحریر کی نقل کرنے کے لئے ہم نے انتہائی محنت کرکے ایک شخص کو تیار کرلیا۔ جو ہارون کی تحریر میں خط لکھتا تھا' جو یہاں سے باہر بھیجے جاتے تھے اور ہمارے کرم فرما جو باہر ہیں یہ ان کا احسان ہے کہ وہ ہی خطوط پوسٹ کرکے براہ راست اس بزرگ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ بزرگ کو خطوط سے کچھ ڈھارس بندھ گئی' لیکن اب اس کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ اس کے پوتے کو جلد بلایا جائے' اس نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے' اور ہم لوگوں کی انتہائی کوششوں سے حکومت کو بھی اس معاملے میں ملوث ہونا پڑ گیا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد اس کے پوتے کو بلوا لیا جائے گا!

یہ قطعی اتفاق ہے سردار کہ تم اس سے اس قدر مشابہہ ہو کہ دنیا کا ہر فرد دھوکہ کھا سکتا ہے' چنانچہ شیراز اور محمود نے تمہیں دیکھ کر دیوانہ وار اس بات کا فیصلہ کیا کہ تمہیں اس کردار کی ادائیگی کے لئے تیار کر لیا جائے' انہوں نے جس انداز میں یہ قدم اٹھایا اور انتہائی احمقانہ اور ناجائز تھا' اس کا ہم سب کو افسوس ہے' ہم تو یہ جانتے ہیں کہ کسی نیک کام کی ادائیگی کے لئے کوئی نیک انسان منہ موڑ ہی نہیں سکتا' ہمیں تم سے بھی یہی امید

ہے سردار۔ اگر تم اس سوگوار بوڑھے کو دیکھ لو تو تم خود بھی ہمارے اس فیصلے کی تائید کرو گے.... اور سردار اس بات کو تم جانتے ہی ہو گے کہ کسی کے کام آنا کتنا بڑا ثواب ہے.... لیکن محمود اور شیراز کی غلط حرکت سے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی اور تم نے ہمارے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔

اگر یہی بات ہم تم سے دوسرے انداز میں کہتے تو تم تیار ہو جاتے۔" لڑکی نے کہا در میں اسے بغور دیکھتا رہا' پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اگر تم سچ کہہ رہی تو واقعی یہ کام اتنا برا بھی نہیں ہے' لیکن بی بی میرے اپنے مسائل اس کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔؟"

"اوہ ڈیر سردار جب تم ہمارے کسی معاملے میں اپنے آپ کو ملوث کرنے کے لئے تیار ہو تو تمہارے مسائل بھی تمہارے مسائل تو نہیں رہے' ہم بھی تو ان میں برابر کے شریک ہیں' ہم ہر وہ کام کریں گے' جو تمہاری سہولت کے لئے ہوگا!"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان اپنے مسائل سے خود ہی بہتر طور پر نمٹ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل درست کہا آپ نے لیکن ڈیر سردار' ایک بات کا میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

"وہ کیا....؟" میں نے سوال کیا۔

"تم چونکہ ہمارے لئے ایک ایسا کردار ادا کر رہے ہو جو ہمارے لئے انتہائی اہم ہے' اور بڑی محنت کرنا پڑے گی' محسوس مت کرنا سردار نیکی کا کام تو ہے' لیکن تمہاری اس محنت کے معاوضے کے طور پر تمہیں اتنا کچھ دیا جائے گا کہ تم فکر معاش سے آزاد ہو جاؤ گے۔ صرف محنت سے اپنا کردار ادا کردو۔"

"ٹھیک ہے فوزیہ صاحبہ میں تیار ہوں!"

"اگر تم تیار ہو سردار تو اپنا یہ مقصد ترک کردو!"

"کیا مطلب؟"

"مقصد یہ کہ ہم لوگوں کے بارے میں برے انداز سے سوچنا ترک کردو' اور اس فرض کی ادائیگی کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرلو۔"

"لیکن ان لوگوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا فوزیہ صاحبہ!"

"ٹھیک ہے میں جانتی ہوں!"

"پھر اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"لیکن اب تو خود کو سنبھال لو سردار۔"

"ٹھیک ہے' میں خلوص دل سے تمہارے کام کے لئے تیار ہوں' اور گزری ہوئی باتوں کو بھول جاتا ہوں۔" میں نے کہا اور فوزیہ نے میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"تم بے شک اپنے نام کی طرح فراخ دل ہو' مجھے میری بے تکلفی کے لئے معاف کر دینا' اور تم نے اپنی رہائش گاہ کہاں بتائی تھی۔۔؟"

"جیکب لائن!"

"وہاں تمہارا کون ہے؟"

"کوئی نہیں! لیکن وہ میرے سہارے ہیں!"

"کیا مطلب؟"

"کراچی کی زیریں زمین پر میرے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے فوزیہ میں تو نوکری کی تلاش میں آیا تھا' لیکن مجھے قدم قدم پر ٹھکرایا گیا' اور پھر نوکری ملی تو ایسی جس کی وجہ سے میں جیل پہنچ گیا۔ تین مہینے کی قید کاٹی۔

"یہ تم ہی ہو.... حالات انسان کو بہت بدل دیتے ہیں' نہ جانے کیا بنا دیتے ہیں' اور ابھی تو کچھ نہیں ہے' تھوڑے عرصہ کے اندر تم جو کچھ بن جاؤ گے وہ تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا' اب باہر چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گردن ہلا دی!"

"میں لباس بدل آؤں' ابھی آئی!" فوزیہ باہر نکل آئی' اور پھر جب وہ آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا' مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی' اور بے حد حسین نظر آ رہی تھی' اس کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے مجھے عجیب لگا۔

"بہرحال کار عمارت سے باہر نکل گئی' میں نے باہر سے بھی اس عمارت کو دیکھا' وہ نہیں تھی جس میں۔ میں پہلی بار آیا تھا' گویا بے ہوشی کے عالم میں مجھے کسی دوسری عمارت میں لایا گیا تھا۔

فوزیہ کار چلا رہی تھی' اور کراچی کی سڑکیں مجھے اجنبی لگ رہی تھیں۔ آج کراچی کو میں نے بہت نئے انداز سے دیکھا تھا' ہاں کار میں بیٹھ کر لوگ اس خوبصورت شہر کو اسی طرح دیکھتے ہوں گے۔ واقعی یہ تو بڑی حسین جگہ ہے' بشرطیکہ انسان مصائب کا شکار نہ ہو' مصائب کی آنکھ اور خوشحالی کی آنکھ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

ہم لوگوں نے خوب سیر کی' رات کو ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ پھر ایک فلم دیکھی اور اس کے بعد واپس گھر آ گئے' بلاشبہ یہ کراچی کا نیا رنگ تھا اور میری زندگی کا بھی!

لیکن نہ جانے آئندہ اور کون کونسے نئے رنگ میری زندگی میں بکھرنے والے تھے' میں ان سارے رنگوں کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا!....

"پانچ دن گزر چکے تھے مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے' ہر شام فوزیہ میرے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جاتی تھی۔ اس نے میرے لئے بے پناہ خریداری کی تھی' تقریباً دو درجن سوٹوں کے کپڑے خریدے گئے تھے' ٹائیاں' جوتے' موزے' اور نہ جانے کیا کیا۔

"اس دوران مجھ سے غیاث کے لئے ایک خط بھی لکھوایا گیا تھا' جس میں میں نے لکھا تھا کہ اچانک ایک ضروری کام میں مصروف ہو گیا ہوں' وہ لوگ فکرمند نہ ہوں۔ بہت جلد ان سے ملاقات کروں گا۔ یہ خط پوسٹ کرا دیا گیا۔

دن رات سکون سے گزر رہے تھے' لیکن نہ جانے کیوں خمیرے ذہن میں ایک خلش تھی' ایک انوکھی خلش جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ لوگ تو گویا میرے غلام بن کر رہ گئے تھے۔ یہاں کے سارے ملازم میرے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے' سب کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوش رکھا جائے۔

اور ان سب کی سپہ سالار ایک طرح سے فوزیہ تھی' میں نے فوزیہ کے اندر بھی کچھ خوبیاں دیکھی تھیں' وہ تصنع سے پاک تھی نہایت صاف ستھری گفتگو کرتی تھی' اس کا اپنا ایک وقار تھا' اور آہستہ آہستہ میں اس ماحول میں ضم ہوتا جا رہا تھا!

"لیکن جب کبھی کبھی دوسروں کا خیال آتا' بے چینی کی ایک لہر سی اٹھتی اور میں بے کل ہو جاتا تھا' ایک شام فوزیہ میرے ساتھ ڈرائیوان میں فلم دیکھ رہی تھی' حالانکہ فلم خاصی دلچسپ تھی' اس کی کہانی کسی قدر میری کہانی سے ملتی جلتی تھی' اور اس بات نے میرے اوپر اثر کیا' میں کچھ مضمحل سا ہو گیا تھا۔

"سردار...." فوزیہ نے شاید یہ بات محسوس کر لی تھی' اور میں چونک پڑا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" کہاں کھوئے ہوئے ہو۔"؟ فوزیہ نے پوچھا۔

"اوہ کوئی خاص بات نہیں' بس اس فلم کی کہانی...." میں نے الجھے ہوئے انداز سے کہا۔

"تمہاری کہانی سے ملتی جلتی ہے' کیوں....؟" فوزیہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں فوزیہ کسی حد تک تم جان چکی ہو' میرا خیال ہے اس کے بعد تم میری ذہنی کیفیت سمجھ رہی ہو گی۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا' اور فوزیہ مسکرا کر بولی۔

"لیکن تم پریشان کیوں ہو۔؟"

"بس فوزیہ اسے ایک جذباتی بات بھی کہہ سکتی ہو۔"

"کیوں آخر کیوں.... کیا تم مجھے اپنے دل کی بات نہیں بتا سکتے۔" فوزیہ نے محبوبانہ انداز میں کہا۔ میں نے اس وقت اس کے اندا میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہو اور اکثر میں نے محسوس کیا تھا کہ فوزیہ کا انداز بعض اوقات بدل سا جاتا ہے' لیکن اس بات پر میں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی' اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔

"فوزیہ دراصل بعض وقت میری کیفیات کچھ عجیب سی ہو جاتی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں! میں نے کہا نا میں نے اکثر محسوس کیا ہے سردار!"

"کیا یہ غیر فطری بات ہے۔؟"

"ہرگز نہیں' ہر انسان کے ذہن میں بے شمار خیالات جنم لیتے ہیں' لیکن سردار بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی اپنے سے کہہ دی جاتی ہیں' اور اپنے کا تعین کرنا واقعی بڑا مشکل کام ہے' لیکن اگر کوئی خود کو پیش کرے تو اسے ٹھکرانا نہیں چاہئے۔" فوزیہ نے اپنائیت سے کہا۔

"نہیں فوزیہ ٹھکرانے کی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر تم مجھے اپنے دل کی باتیں کیوں نہیں بتاتے؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' میں تو تمہیں بہت کچھ سمجھتا ہوں فوزیہ۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں!"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی' دراصل انسان عجیب حیثیت رکھتا ہے کبھی کبھی وہ حالات کے تحت کسی سے اس قدر نزدیک ہو جاتا ہے کہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنا سب کچھ سمجھ لے میں بھی اسی کیفیت کا شکار ہوں۔ سردار' یقین کرو ان ساری باتوں سے ہٹ کر بھی تمہارا ایک خاکہ میرے ذہن میں ہے' جو نجانے کیا ہے!"

"فوزیہ تم میری پوری شخصیت سے واقف ہو!"

"ہاں' کیوں نہیں۔" فوزیہ نے جواب دیا۔

"تو فوزیہ تم ایک بات سمجھ لو!"

"کیا۔"

"کراچی میں رہ کر مجھے لوگوں سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہو گئی ہے' لیکن اب بھی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں بہتر طور پر انسان کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہوں!"

"ٹھیک ہے تو پھر۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"مجھ سے جو کچھ کہا کرو صاف صاف کہہ دیا کرو۔" میں نے کہا اور فوزیہ گردن جھکائے رہی' پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں سردار...." وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں' کیا کوئی بہت مشکل بات ہے۔؟" میں نے پوچھا۔ فوزیہ کی توجہ فلم کی جانب اب بالکل نہیں رہی تھی' وہ کسی خاص خیال میں ڈوب گئی تھی' پھر اس نے گردن ہلائی اور بولی۔

"ہاں!"

"تو کہونا۔!"

"سردار! میں ذہنی طور پر تم سے بہت متاثر ہوگئی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا کیوں ہوا' ایک فرض میرے سپرد کیا گیا تھا' ہم سب ایک فرض کے تحت کام کر رہے ہیں' لیکن بس دل کم بخت عجیب و غریب خصوصیات کا حامل ہوتا ہے' بعض اوقات ایسی الجھن میں پھنسا دیتا ہے کہ انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"ہاں فوزیہ اس میں کوئی شک نہیں ہے!"

"بس میں یہی کہنا چاہتی تھی سردار کہ باقی معاملات جو کچھ بھی ہیں' لیکن اگر کوئی بات تمہارے ذہن کو متاثر کرے اور تم یہ سوچو کہ اس مسئلے میں تمہیں کسی کی ضرورت ہے تو خدا کے لئے مجھ سے تکلف مت کرنا۔"

"تکلف کہاں کرتا ہوں فوزیہ۔" میں نے سوال کیا۔

"نہیں تم دل کی بات کہنے میں ہچکچاتے ہو۔"

"نہیں یہ صرف تمہارا خیال ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر بتاؤ اس فلم کو دیکھ کر تمہارے ذہن میں کیا خیال آیا!"

"بس یونہی فوزیہ' تم جانتی ہو' زیادہ لوگ میری زندگی سے متعلق نہیں ہیں' غیاث اس کی ماں اور اس کی چھوٹی بہن نے میرے ساتھ جو سلوک کیا' اس نے مجھے وہ اپنائیت فراہم کردی جسے میں گھر سے نکل آنے کے بعد بھول بیٹھا تھا۔ میرے گھر میں میرے بعد اب میری بہنیں ہیں جو مجھے بے پناہ چاہتی ہیں اور جن کی آس بھری نگاہیں میرے اوپر لگی ہوئی ہیں' یقین کرو جب ان کا خیال آتا ہے تو دل برا کہنے لگتا ہے۔"

"آخر کیوں۔ میں نے بھی تو تم سے کچھ کہا تھا!"

"یقین کرو فوزیہ' اتنے سے کام کا اتنا بڑا معاوضہ وصول کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ معاوضہ تو نہیں ہے سردار!"

"تو پھر کیا؟"

"بس تم ایک نیک کام کے لئے کوشش کر رہے ہو اور میں اس میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں' مجھے خود سے کسی طور علیحدہ مت سمجھو۔" فوزیہ نے کہا اور میں پریشانی سے

کچھ سوچنے لگا.... فوزیہ جو کچھ کہہ رہی تھی' میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا تھا' بھلا اس نیک کام کے لئے ان لوگوں سے اتنا بڑا معاوضہ کس طرح وصول کروں' فلم کی طرف سے ہماری توجہ بالکل ختم ہوگئی تھی' حالانکہ فلم خاصی دلچسپ تھی' تب فوزیہ نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"اب کس سوچ میں ڈوب گئے ہو۔؟"

"بس کوئی خاص سوچ نہیں ہے!"

"تم سارے خیالات ذہن سے نکال دو سردار' بس یوں سمجھو کہ میں ہر طرح سے تمہاری ساتھی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے سینے میں اپنا دل رکھ دوں تاکہ تم میری سوچ سے واقف ہوجاؤ۔"

"تمہارا شکریہ فوزیہ میرے ذہن میں صرف یہ ایک تردد تھا جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہر قسم کا خیال ذہن سے نکال دو.... اور ہاں سنو' تم کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا ہم تمہاری ان الجھنوں سے بے نیاز ہیں!"

"کون سی الجھنوں سے۔؟"

"مقصد یہی ہے کہ یہ الجھنیں جو تمہارے ذہن کو پراگندہ کرتی ہیں۔ اور ان میں اول بات غیاث کی ہے اس لئے ہماری یہ کوشش ہے کہ تمہاری خواہش کے مطابق غیاث کو ایک ایسی زندگی فراہم کر دی جائے کہ وہ اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکے اور اسے ایک ایسی مالی معاونت بھی مل جائے جو اس کے گھرانے کو چلا سکے۔"

"یہ بہت ہی اچھا کام ہوگا فوزیہ' بلاشبہ وہ لوگ اس کے مستحق ہیں' خاص طور سے اس لئے کہ ان کا تعلق میری ذات سے رہ چکا ہے۔"

"تمہاری ذات ہمارے لئے کس قدر افضل ہے' اس کے بارے میں تم نہیں سوچ سکتے!"

"وہ تو ٹھیک ہے' لیکن میرا ضمیر مجھے مطمئن نہیں رہنے دیتا۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں باربار تم سے اس بات کا تذکرہ کر رہا ہوں!"

"دیکھو سردار جو کچھ تمہارے لئے کیا جا رہا ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ تم پوری طرح خاطر جمع ہو جاؤ' تم یہ سمجھو کہ جو لوگ تمہارے ساتھ شامل ہیں وہ پوری طرح تم سے محبت کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ خرچ ہو رہا ہے اس کے بارے میں تم یہ سمجھ لو کہ اس کا تعلق سو فیصدی اس شخص کی ذات سے ہے' جس کے نزدیک پیسوں کی

کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس کی دولت اس قدر ہے کہ وہ چاہے تو بہت کچھ خرید سکتا ہے۔ لیکن صرف ایک حادثے نے اسے اس قدر مفلوج کر دیا ہے کہ اب وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا، ہم جانتے ہیں کہ تم اس قدر خاطر جمع ہو جاؤ کہ جو کام کرو پورے سکون کے ساتھ کرو.... اور تمہارے اس سکون کے لئے سردار ہم بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں، ہم تمہیں ذہنی طور پر صحت مند چاہتے ہیں۔ بیمار نہیں۔" فوزیہ نے کہا۔

"گویا تمہاری بلکہ تم لوگوں کی ذات پر ان اخراجات کا کوئی بوجھ نہیں پڑ رہا...." میں نے سوال کیا۔

"قطعی نہیں، بالکل نہیں، تم اس سلسلے میں بالکل مت سوچو۔" فوزیہ نے خوش دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہے فوزیہ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک خودغرض انسان کی حیثیت سے تمہاری نگاہوں میں نہ رہوں!"

"بالکل نہیں رہو گے، تم بہت بڑی شخصیت کے مالک ہو، تمہارے لئے اگر چھوٹے چھوٹے کام کر دیئے جائیں تو ان کی کوئی قیمت نہیں رہتی، ہاں کل یا پرسوں تک ہمارا پہلا مرحلہ مکمل ہو جائے گا۔"

"پہلا مرحلہ؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں میرا مطلب ہے، غیاث کے لئے ایک عمدہ جگہ بک اسٹال قائم کر دیا گیا ہے، اور شاید کل یا پھر پرسوں ہم تمہاری ملاقات غیاث سے کروا دیں گے!"

"اوہ! بک سٹال کہاں بنایا گیا ہے؟"

"پرانی نمائش کے ایک بہترین علاقے میں، سارے کام مکمل کر دیئے گئے ہیں، سامان بھر دیا گیا ہے، بس اس کا افتتاح باقی ہے۔"

میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، غیاث اور امی کتنی خوش ہوں گی، غیاث کا مستقبل بن جائے گا، لیکن، لیکن میں ان لوگوں سے کیا کہوں گا! میں انہیں تفصیل تو بتا ہی نہیں سکتا۔

گھر واپس آیا تو بھی ذہن انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک مخصوص وقت کے بعد فوزیہ میرے پاس نہیں رہتی تھی، اور عام حالات میں وہ صبح سے شام تک میرے ساتھ ہی ہوتی تھی!

"لیکن میں.... کیا میری زندگی غیر یقینی حالات کا شکار نہیں ہے، کیا میں کسی ٹھوس زندگی میں ہوں، کیا میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کیا میں کسی ٹھوس زندگی میں ہوں، کیا میرا

مستقبل محفوظ ہے۔ کیا ان لوگوں کے کام کے اختتام کے بعد؟

اور پھر میرے ذہن میں لالچ ابھر آیا، جیسا کہ ان لوگوں نے پیشکشیں کی ہیں، اگر ان کردار کو ادا کرتے ہوئے میرا کام بھی بن جائے تو کیا حرج ہے، اس دنیا کا کام ایسے ہی چلتا ہے، تو پھر میں کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں، میں خود کسی کو دھوکہ نہیں دے رہا، میں نے کوئی فراڈ تو نہیں کیا ہے!

اور ان خیالات نے مجھے مطمئن کر دیا، جیسا کہ فوزیہ نے کہا ہے، اگر یہ بات ہے تو ان کاموں کا انہیں کوئی مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا تو ٹھیک ہے پھر میں کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں، یہاں میری سوچ عام انسانوں سے مختلف نہیں تھی!



دوسری صبح فوزیہ حسب معمول ایک نئے اور خوبصورت لباس میں میرے پاس پہنچ گئی' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناشتہ تیار ہے حضور انور!"

"میں بھی تیار ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا' میں نے نہا کر سفید شلوار کرتہ پہن لیا تھا جو فوزیہ نے میرے لئے تیار کروایا تھا۔ فوزیہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور وہ بے اختیار مسکرا پڑی۔

"تو آیئے!" اس نے ایک ہاتھ لہرا کر کہا۔

"شکریہ' آپ بھی چلئے۔" میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ آگے بڑھنے لگی!

"خدا کی قسم دل خوش ہوگیا اس وقت!"

"خوب' کیوں؟"

"تمہیں خوش دیکھ کر!"

"اب تم لوگوں نے میرے لئے اتنی خوشیاں مہیا کر دی ہیں تو میں خود کو کس طرح روکوں!"

"خدا تمہیں سارے زمانے کی خوشیاں دے سردار' میری یہی دعا ہے کہ تم کبھی کسی الجھن میں نہ پڑو؟"

"مجھے ایسے مخلص لوگوں کے مل جانے کی امید نہیں تھی فوزیہ۔"

"بعض کام امید کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں بھی ایسا کوئی خیال نہیں تھا کہ ہمیں ہارون کا ایسا نعم البدل مل جائے گا۔ ہم تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔"

"کیا۔؟"

"بس سردار.... ابھی بہت سی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکیں گی!"

"کیوں؟"

"پلاسٹک سرجری کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔؟"

"نہیں بھائی ابھی میری تعلیم اتنی آگے نہیں بڑھ سکی!"

"وہی میں کہہ رہی تھی کہ' پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے کے نقوش کو تبدیل کر لیا جاتا ہے' لیکن وہ اتنے پائیدار نہیں ہوتے کہ ہمیشہ قائم رہ سکیں' ان میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے' اور بعض اوقات صحیح پلاسٹک سرجری بھی نہیں ہوسکتی' اس کے علاوہ اس ملک میں ممکن بھی نہیں تھا۔"

"مگر اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی بتا رہی ہوں.... ہم نے دادا جان کی حالت اس قدر خراب دیکھ کر یہ سوچا کہ کیوں نہ کسی شخص کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کرا کے اسے ہارون کی شکل دے دی جائے' اول تو اس کام کے لئے کسی مناسب آدمی کا انتخاب ایک مشکل کام تھا' دوسری بات یہ کہ ہمیں خطرہ تھا کہ اگر کبھی وہ صورت پہچان لی گئی تو بڑی مشکل ہوگی' لیکن تم نے ہماری ساری مشکلات حل کر دیں۔"

"بہرصورت حیرت کی بات ہے کہ میں ہارون صاحب سے اس قدر مشابہہ نکلا'

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں' ہم میں سے جس کسی نے بھی تمہیں دیکھا' یوں لگا

جیسے ہارون ہمارے سامنے کھڑے ہوں!"

"خیر ٹھیک ہے' بلکہ مجھے خوشی ہے کہ میری ناچیز ذات تمہارے کسی کام آسکی!" میں نے کہا اور فوزیہ مسکرانے لگی۔

ناشتہ کی میز پر بیٹھ کر ہم دونوں نے ناشتہ شروع کر دیا' ہمارے علاوہ اور کوئی تیسرا نہیں تھا' اور عموماً نہیں ہوتا تھا' افضال صاحب وغیرہ کم ہی آتے تھے' دوسرے لوگ ملازم ٹائپ لوگ تھے' محمود اور شیراز کو بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا' گھر پر یوں سمجھا جائے کہ عام طور پر سے میری معیت میں فوزیہ ہی رہتی تھی' چنانچہ ہم ناشتہ کرتے رہے ناشتہ کے دوران فوزیہ نے کہا۔

"رات میں نے تم سے اسٹال کے بارے میں کچھ کہا تھا!"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"میں نے یہ کہا تھا کہ یا تو کل یا پھر پرسوں یہ انتظام مکمل ہو جائے گا۔"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"تو آپ کی اطلاع کے لئے یہ عرض ہے کہ آج آپ اس بک سٹال کی چابی اور مالکانہ حقوق کے کاغذات اپنے عزیز ترین بھائی غیاث کے سپرد کر دیں گے' اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ سن کر بے پناہ خوشی ہوگی.... کیوں' صحیح کہہ رہی ہوں نا۔" فوزیہ نے محبوبیت سے پوچھا۔

"واقعی فوزیہ...." میں نے دلی مسرت دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادار کروں!"

"کسی زبان سے بھی نہیں' بلکہ آپ شکریہ ادا کریں گے تو جھگڑا ہو جائے گا۔" فوزیہ نے مصنوعی طور پر برا ماننے کے انداز میں لہا اور میں ہنسنے لگا!

"لیکن فوزیہ تمہیں یہ بات کیسے پتہ چلی۔؟"

"ٹیلی فون کیا تھا افضال صاحب نے!"

"کب....؟"

"صبح ہی صبح.... انہوں نے کہا تھا کہ ٹھیک گیارہ بجے میں آپ کو لے کر صدر پہنچ جاؤں' صدر میں افضال صاحب مل جائیں گے' اور پھر وہ بک سٹال ہمارے حوالے کر دیں گے!"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میرا مقصد ہے کہ بک سٹال کی چابی وغیرہ ہمارے حوالے کرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

"بس اس کے بعد ہوگا یہ جناب کہ آپ جائیں گے اپنی امی محترمہ کے پاس اور وہاں جا کر غیاث کو طلب کریں گے' اور اس کے بعد باقی کام آپ کا اپنا ہے۔" "کہ آپ کس طرح ان لوگوں کو سمجھائیں گے' بس یوں کہہ دیں کہ کافی عرصہ تک آپ کی ملاقات ان سے نہیں ہوگی' کیونکہ آپ باہر جا رہے ہیں!"

"میں کہہ دوں گا!"

"شام تک آپ کی چھٹی رہے گی اور اس کے بعد ٹھیک سات بجے آپ جیکب لائن کے بس اسٹاپ پر پہنچ جائیں گے' جہاں سے میں آپ کو لے لوں گی' کیا سمجھے!"

"سمجھ گیا!"

"اوہو.... اوہو' ناشتہ تو کریں' آپ تو ضرورت سے زیادہ خوش ہو گئے' ناشتہ کریں ناشتہ' مجھے آپ کی صحت کی بھی فکر ہے۔" فوزیہ کے انداز میں بڑی اپنائیت ہوتی تھی۔

میں ناشتہ کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں فارغ ہوگئے۔

"درزی کپڑے لے آیا ہے' ذرا پہن کر دیکھ لیں' رات ہی کو اسے کہا تھا۔" فوزیہ بولی' اور میں اس کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

اعلیٰ درجے کے سوٹ تھے' جنہیں پہن کر میں نے آئینے میں دیکھا اور ششدر رہ گیا' فوزیہ بھی قربان ہو جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی' "خدا کی قسم کیا لگ رہے ہو' کوئی میرے دل سے پوچھے!"

"بس بس.... باقی آئندہ۔" میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ فوزیہ کے مشورے سے میں نے شلوار قمیض میں رہنا مناسب سمجھا تھا' ٹھیک گیارہ بجے ہم صدر پہنچ گئے' وہاں مونچھوں والے افضال صاحب موجود تھے۔ مسکراتے ہوئے ہماری کار میں آ بیٹھے۔

"چلو بھئی' اور کیسے ہیں ہمارے ہارون صاحب۔" افضال صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں!"

"ماشاء اللہ ان کی تو شخصیت ہی نکھر گئی ہے' نگاہ نہیں ٹھہرتی ان پر۔" افضال صاحب نے کہا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"یہ کاغذات ہیں افضال صاحب' بک سٹال کی دوکان غیاث کے نام پر حاصل کی گئی ہے' سارا سامان بھی انہیں کے نام سے ہوگا! ایک ملازم بھی رکھ لیا گیا ہے' جو دوکان

چلائے گا' اسے سارا کام سمجھا دیا گیا ہے' چنانچہ آج شام کو تین بجے وہ دوکان پہنچ جائے گا۔ اور آپ اسے غیاث سے ملا دیں۔"

"اس وقت وہ کہاں ہوگا؟"

"اسٹال پر۔" افضال صاحب نے جواب دیا' اور میں خاموش ہوگیا' صدر سے پرانی نمائش کا فاصلہ چند منٹ کا تھا' ہم سٹال کے سامنے پہنچ گئے' شیشے کے خوشنام شوکیس' ان میں سجی ہوئی کتابیں اور رسائل بک رہے تھے۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا' دوکان پر غیاث بک اسٹور لکھا ہوا تھا' میری گردن فرط ممنونیت سے جھک گئی اور ہم تینوں نیچے اتر آئے۔

"علیم الدین' یہ ہیں سردار صاحب' تم تین بجے یہاں آ جانا یہ تمہیں سٹال کے مالک سے ملا دیں گے!" افضال صاحب نے ملازم سے کہا۔

"بہت بہتر جناب!"

"باقی کا کام تم بہتر طور سے سنبھال سکتے ہو۔" آپ مطمئن رہیں جناب!

"ٹھیک ہے سردار صاحب' اب آپ جہاں کہیں میں آپ کو اتار دوں۔"

"یہیں ٹھیک ہے' میں آپ چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا' علیم الدین نے اسٹال بند کر دیا تھا اور پھر اس نے چابی میرے حوالے کردی' میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں غیاث وغیرہ کے لئے اتنا کچھ کرسکوں گا۔ کیا حال ہوگا ان لوگوں کا۔

وہ لوگ رخصت ہوگئے اور میں چابی لے کر دیر تک کھڑا سوچتا رہا' بلاشبہ کسی کے لئے کچھ کرنا دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے' حالانکہ جو کچھ ہوا تھا وہ میری قوت بازو کا نتیجہ نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود میری ذات اس میں ملوث تو تھی' میں کچھ لوگوں کے لئے اس قدر دلکشی اختیار کر گیا تھا کہ انہوں نے یہ سب کچھ میرے لئے کیا تھا۔ اس لئے میرا وجود کم از کم غیاث اور اس کے گھرانے کے لئے فائدہ مند تو ثابت ہوا۔ میں نے سوچا اور پھر میں دل میں بے پناہ مسرتیں لئے ہوئے غیاث کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

کئی دن کے بعد اس طرف آیا تھا' جن لوگوں سے شناسائی ہوگئی تھی' انہوں نے محبت سے سلام و دعا کی' خیریت پوچھی اور میں نے ان میں سے چند خاص لوگوں کو بتایا کہ میں ایک ضروری کام سے گیا ہوا تھا"

غیاث کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اور پھر اندر داخل ہوگیا.... صحن میں امی روشن کی جوئیں دیکھ رہی تھیں' مجھے دیکھا تو اچھل کر کھڑی ہوگئیں' روشن بھی خوشی سے چیخ پڑی تھی آ ہاہا سردار بھیا آ گئے۔" وہ دوڑ کر مجھ سے

لپٹ گئی۔

"کہاں چلے گئے تھے' کیا ہوگیا تھا۔" انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے لپٹا لیا اور پھر بولیں۔ "کیا ہم اس قابل نہیں تھے کہ تم ہمیں بتا کر جاتے' بڑا ہی کٹھن وقت گزرا ہے ہم پر' تمہیں کیا معلوم' غیر جو ہوئے۔" امی محبت بھرے لہجے میں شکایت کرنے لگیں۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں' میں نے انہیں سینے سے لگالیا۔

"آپ یقین کریں امی' غیریت کی بات بالکل غیر مناسب ہے' ایسی کوئی بات نہیں ہے' بس کچھ اتفاقات ایسے ہی پیش آگئے تھے۔"

"کیا اتفاق پیش آگیا تھا آخر' ایسی کونسی بات تھی جو تم گھر بتائے بغیر چلے گئے!"

"امی امی غصہ تھوک دیں' خدا کی قسم میں بالکل مجبوری کی حالت میں آپ کو اطلاع دیئے بغیر چلا گیا تھا' اور پھر کچھ صورت حال ایسی تھی کہ میں نے یہ بات برداشت کرلی کہ آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے یہ بات برداشت کرلی اور اس بات کا احساس نہ ہوا کہ میں کتنی پریشان ہوں گی!"

"مجھے پورا پورا احساس تھا امی آپ کی اور غیاث کی پریشانی میرے ذہن میں تھی۔"

"تو پھر تو اس طرح کیوں چلا گیا۔"

"چلا نہیں گیا امی لے جایا گیا تھا۔"

"کیا مطلب۔"؟" امی چونک پڑیں!

"ہاں' آپ اگر مجھے مہلت دیں تو میں آپ کو ساری تفصیلات سے آگاہ کردوں۔"

"لائے ہو گے کوئی گھڑکر۔" امی نے ناز بھرے انداز میں کہا' اس طرح جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے پر کر سکتی ہے۔

"نہیں امی' آپ مجھے بتایئے میں نے کبھی آپ سے جھوٹ بولا ہے' میں نے نہایت سادگی سے امی سے پوچھا۔

"بولا تو نہیں' لیکن اب بتاؤ کیا کہو گے۔"

"امی دراصل مجھے کچھ ایسے لوگ مل گئے تھے۔ جنہوں نے مجھے ایک بہت اچھی ملازمت کی پیشکش کی ایسی ملازمت امی جو میری تقدیر بدل دے' میں نے کہا اور امی نے جلدی سے سوال کیا۔

"اچھا کہاں مل گئے تھے وہ لوگ؟"

"بس اسٹور میں آگئے تھے۔ نجانے انہیں میری کیا چیز پسند آئی کہ انہوں نے مجھے یہ پیش کش کردی!"

"ہوں پھر!"

"پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کا کام اتنا اہم اور ضروری ہے!"

"اچھا تو ساتھ لے جانے کے بعد انہوں نے تمہیں گھر سے نکلنے کو بھی منع کر دیا۔"

"یہ بات نہیں ہے امی' وہ مجھے یہاں سے باہر لے گئے تھے' کام اتنا ہی جلدی اور ضروری کا تھا کہ میں انہیں فوری طور پر منع نہیں کر سکا! سب جو کچھ ہوا میری لاعلمی ہی میں ہوا.... ان لوگوں کے لئے' میں واقعی اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا!"

"مگر کام کیا ہے.... کون لوگ ہیں وہ....؟" امی نے پوچھا۔

"بہت اچھے لوگ ہیں وہ' بس یوں سمجھو امی کہ میری تقدیر کھل گئی ہے' ہماری قسمت نے بالکل ہی ایک نیا رخ اختیار کیا ہے' ایسا کام ہے جو میں آسانی سے کرسکتا ہوں اور اس کا معاوضہ امی آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ مجھے اس کا معاوضہ کیا مل رہا ہے۔"

"تعجب کی بات ہے' آخر ایسا کیا کام ہے۔؟"

"بس امی صحیح تفصیلات تو مجھے خود بھی معلوم نہیں' لیکن میں ان لوگوں کے لئے بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہوں' اور انہوں نے مجھے اتنی رقم ایڈوانس میں دی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اوہو! ایسا آخر کیا کام ہے' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ بیٹے کسی غلط چکر میں مت پھنس جانا' یہ دنیا بڑی خراب ہے' لوگ نئے نئے طریقوں سے سادہ لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ تم تو یوں بھی سیدھے سادھے اور انتہائی معصوم ہو کہ آسانی سے کسی کے بھی جال میں پھنس سکتے ہو!"

"بس امی اگر آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہوں تو میں کسی بھی جال میں نہ پھنس سکوں گا' بس آپ یہ دعائیں کریں کہ میں نے جس مقصد کے لئے ان لوگوں کے ساتھ شمولیت اختیار کی' وہ مقصد پورا ہو جائے اور میں اس میں کامیابی حاصل کرلوں۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹے' مگر میں تمہارے لئے فکر مند ہوں آخر ایسا کونسا کام ہے جس کے لئے انہوں نے تمہیں؟"

"بس امی کیا بتاؤں' نقد تو میں نے ان سے تھوڑے ہی پیسے لئے ہیں' لیکن کچھ اور کام کر لیا ہے۔"

"کیا۔؟ آؤ بیٹھو چائے پیئو گے یا کھانا کھاؤ گے؟"

"چائے بھی پیئوں گا اور اس کے بعد کھانا بھی کھاؤں گا' لیکن غیاث کے ساتھ!"

"تمہیں نہیں معلوم غیاث کتنا ہراساں ہو رہا تھا!"

"کیا کہہ رہا تھا!" میں نے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا کہ کسی کے بدن میں اپنا خون شامل ہونا ضروری ہوتا ہے امی' اگر یہ بات ہے تو پھر میرے دل میں سردار بھیا کا اتنا پیار کیوں ہے' یہ پیار ان کے دل میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیں غیروں کی طرح چھوڑ کر کیوں چلے گئے!"

"میرا خط نہیں ملا تھا امی....؟"

"ملا تھا' اس وقت اسے سکون ہوا' ورنہ دو دن تک کالج بھی نہیں گیا تھا!"

"مجھے یقین تھا میرا بھائی میرے لئے کتنا پریشان ہوگا!"

"روشن مجھے.... چائے پلاؤ۔" میں نے روشن سے کہا جو ایک طرف کھڑی مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ابھی پلاتی ہوں بھیا' مگر کیا ان لوگوں نے آپ کے کپڑے بھی اتار لئے۔؟" روشن نے ہنس کر کہا۔

"کیوں.... یہ پہنے تو ہوئے ہوں!"

"وہ تو نہیں جو پہن کر گئے تھے!"

"اوہ' بہت باتیں بنانے لگی ہو' جاؤ چائے کا پانی رکھو' اور ہاں جوئیں نہ گرا دینا اس پانی میں۔" میں نے کہا۔

"میں چائے چھان کر لاؤں گی' آپ فکر نہ کریں' جتنی جوئیں گریں گی نکال کر پھینک دوں گی! ویسے امی بھیا ان کپڑوں میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں!"

"ارے تو جاتی ہے چائے بنانے یا میں بتاؤں تجھے' جوں کہیں کی۔" میں نے کہا اور روشن ہنستی ہوئی باورچی خانے بھاگ گئی۔

"کام نہیں بتایا ان لوگوں نے تمہیں ؟"

"باہر کے کسی ملک میں کوئی کام ہے امی جس کے لئے وہ لوگوں کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ ہیں' بے چاروں نے مجھے بھی ان میں شریک کرلیا۔ بڑی بڑی رقمیں ایڈوانس دے رہے ہیں انہیں!"

"تعجب ہے' ہم نے تو ایسا کام کبھی نہیں سنا۔ بہرحال اللہ تمہیں امان میں رکھے۔"

"میں نے ان سے منع کر دیا تھا امی کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا' لیکن بڑی خوشامد کرنے لگے' میں نے ان کے سامنے کچھ شرطیں پیش کردیں' اور جب انہوں نے وہ شرطیں مان لیں تب میں کہیں تیار ہوا۔"

"کیا شرطیں پیش کیں تم نے؟"

"میں نے انہیں بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی کالج میں پڑھتا ہے۔ میری بہن اور امی ہیں۔ میں انہیں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا' تو انہوں نے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور میں نے



کانہیں جواب دیا کہ میں اپنے غیاث بھیا کے لئے ایک بک اسٹال کھولنا چاہتا ہوں' جس سے اسے خوب آمدنی ہو اور اخبار بھی نہ بیچنے پڑیں' یہ غیاث کی بہت بڑی خواہش تھی امی!"

"اوہ.... پھر....؟"

"بس جب انہوں نے میری یہ شرط پوری کردی تو میں نے ان کی بات مان لی۔"

"کیا مطلب۔؟"

"یہ بک اسٹال کی چابی ہے امی' اس میں مال بھروا دیا گیا ہے' اور ایک ملازم بھی رکھ دیا گیا ہے' جو خود ہی سارے کام کرے گا۔ اور اسٹال کی ساری آمدنی غیاث کو دے گا! گویا غیاث اس بک اسٹال کا مالک ہوگا؟"

"انہوں نے یہ کام کردیا۔؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہ کرتے تو میں تیار کب ہوتا ان کے کام کے لئے۔"

"ارے نہ جانے کیا کام ہے' کہیں کسی مصیبت میں مت پھنس جانا' ہمیں نہیں چاہئے ایسی آمدنی' ہمیں نہیں چاہئے ایسا بک اسٹال' جو خدا دے رہا ہے وہی ٹھیک ہے بس' خود محنت کرکے سب کچھ بنا لینا' ماں باپ کے سہارے ہو بیٹے۔ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے!"

"امی پریشان ہوگئی تھیں' میں انہیں دلاسے دیتا رہا' اور بمشکل تمام وہ پر سکون ہو سکیں!

ہم چائے پی رہے تھے کہ غیاث کی آواز سنائی دی "امی کیا سردار بھیا۔" اور پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"کہاں سن لیا تم نے۔" امی نے کہا۔

"باہر لوگ کہہ رہے تھے۔" غیاث منہ پھلا کر بولا' اور آگے بڑھنے لگا' لیکن میں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا تھا۔

"ایمان سے میں نہیں بولوں گا آپ سے۔ بالکل نہیں بولوں گا!"

"ارے واہ میرے شیر' بس اتنی سی بات پر ناراض ہوگئے۔ یار ایمان سے مجبوری تھی ورنہ!"

"کونسی مجبوری تھی ایسی' آپ کو معلوم ہے میری کیا حالت رہی ہے۔"

"ہاں امی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور میں نے بھی امی کو سب کچھ بتا دیا ہے' چلو چائے پیئو پھر باتیں کریں گے' امی آپ میری مشکل حل کریں اور اسے سب کچھ بتادیں۔"

"بتائیں امی کیا مجبوری تھی بھیا کی۔" غیاث نے کہا اور امی نے متفکر لہجے میں اسے پوری تفصیل بتادی!

"ارے تو.... تو نمائش پر جو اسٹال بنا ہے.... وہ میرے نام ہے۔ وہ.... وہ۔"

غیاث کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے چمک ابھری اور پھر معدوم ہوگئی۔

"جی.... جناب اس کے پروپرائٹر ہیں' اور یہ کاغذات ملاحظہ فرمائیں!" میں نے کاغذات نکال کر غیاث کے سامنے رکھ دیئے۔ اور غیاث ان کاغذات کو دیکھنے لگا' پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"یا تو وہ فرشتے ہیں' یا پھر بے حد چالاک انسان' سردار بھیا مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے!"

"کیا مطلب؟"

"پہلے اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ وہ آپ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں' کیوں آپ کے لئے انہوں نے یہ رقم خرچ کی ہے۔؟"

"غیاث یقین کرو کوئی غلط کام نہیں ہے' میں معلوم کر چکا ہوں!"

"خاک معلوم کر چکے ہیں آپ' اس دنیا میں اتنے شریف لوگ صرف کتابوں اور افسانوں میں پائے جاتے ہیں' جو کسی کی خواہش پوری کردیں' ضرور وہ آپ سے کوئی ایسا کام لینا چاہتے ہیں جس میں انہیں لاکھوں کا فائدہ ہو' اس کے عوض انہوں...."

"ایسی کوئی بات نہیں ہے غیاث!"

"پھر بھی جب تک مجھے اطمینان نہیں ہو جائے گا' میں یہ سب کچھ قبول نہیں کروں گا' میں' میں آپ کو کسی الجھن میں نہیں پھنسنے دوں گا' آپ ہمارے لئے یہ سب کچھ کر جائیں' اور خود مصیبت میں گرفتار ہو جائیں!"

"اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں!"

بڑی مشکل سے میں غیاث اور امی کو راضی کرسکا' غیاث کسی طور مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جب اس سے کہا کہ اگر کوئی غلط بات ہوئی تو میں آسانی سے انہیں چھوڑ کر آجاؤں گا۔ تب وہ راضی ہوگئے۔

پھر امی کھانا پکانے میں مصروف ہوگئیں۔ میں اور غیاث باتیں کرنے لگے تھے۔

غیاث ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکا تھا' وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں ان لوگوں کی کوئی چال ضرور ہے۔

"دیکھ لیں گے غیاث' اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں بھی موم کا بنا ہوا نہیں ہوں۔ میں ان کے جال سے نکل آؤں گا!"

"انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ تمہیں کہاں لے جائیں گے۔"

"ابھی نہیں بتایا' لیکن ظاہر ہے لے جانے سے پہلے یہ تو بتائیں گے' اور میں تمہیں بتادوں گا!"

"تو تم اب کب ان کے پاس جاؤں گے؟"

"شام کو۔"

"آج یہاں نہیں رہو گے!"

"نہیں میں وعدہ کرکے آیا ہوں' ٹھیک تین بجے تم بک اسٹال کھول لو گے' وہ شخص جو بک اسٹال کا ملازم ہے' اس کا نام علیم الدین ہے' ابھی ہم اس سے یہ بات بھی معلوم کرلیں گے کہ اس کی تنخواہ کیا طے کی گئی ہے' اور اس کے بعد غیاث تم بک اسٹال کا چارج سنبھال لوگے' تم اس طرح کیا کرنا کہ علیم الدین اس وقت تک جب تک تم کالج سے واپس نہ آؤ گے۔ بک اسٹال کی دیکھ بھال کیا کرے گا' اسے غالباً سارا کام آتا ہے' پھر تم جب تک چاہو رہنا' ورنہ کام اس کے سپرد کرکے آجایا کرنا!"

"کیا وہ ان کا اپنا آدمی ہے؟"

"پتہ نہیں' میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے' انہیں ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس انہوں نے تو میری فرمائش پر یہ سب کچھ کرکے دے دیا ہے!"

"ٹھیک ہے' جیسا تم کہو گے بھیا..... لیکن بک اسٹال کی آمدنی کا کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا۔ تمہارے امی اور روشن کے کام آئے گی!"

"مجھے اس سے اختلاف ہے۔ امی نے باورچی خانے سے ہانک لگائی' وہ کھانا نکال کر لا رہی تھیں۔

"امی کھانا لئے ہوئے ہمارے نزدیک پہنچ گئیں' انہوں نے کھانا ہمارے سامنے رکھا اور دوبارہ بولیں۔

"مجھے اس سے بالکل اختلاف ہے!"

"کیوں امی؟" میں نے پوچھا۔

"اور ان کا کیا کرو گے جو گاؤں میں تمہارے منتظر ہیں' ان کا حق میں نہیں چھین سکتی۔ یہ جو بھی ہو رہا ہے اس میں ان کا پورا پورا حق ہے' یہ بات میں کہے دیتی ہوں۔"

"امی دیکھئے جب میں نے یہاں کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے' تو کیا آپ کے خیال میں اپنی بہنوں اور ابا کو بھول گیا ہوں گا۔ ایسی بات نہیں ہے امی' آپ ان کا پتہ اپنے پاس رکھ لیں' اگر میں یہاں موجود نہ ہوں تو آپ جا کر معلوم کریں' وہ لوگ یقیناً عیش وعشرت سے رہیں گے!"

"کمال کی بات ہے' میں تو پاگل ہوئی جا رہی ہوں' یہ سوچ سوچ کر کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو تم پر دولت لٹانے کے لئے تیار ہیں....."

"بس امی بے وقوف ہی سمجھ لیں ان لوگوں کو بھی' لیکن آپ یقین کریں کہ اس میں کوئی فریب اور جھوٹ نہیں ہے۔" ان لوگوں کے ان سوالوں سے اب میں عاجز آگیا تھا' بمشکل تمام ہی خاموش ہوئے تھے سب' ورنہ میں جانتا تھا کہ میری بات نہ تو امی نے تسلیم کی ہے اور نہ غیاث نے' ٹھیک تین بجے میں غیاث کو لے کر بک اسٹال پر پہنچ گیا۔



علیم الدین ہمارا منتظر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے غیاث سے اس کا تعارف کرایا اور اس نے جھک کر غیاث کو سلام کیا۔ یہ تمہارے بک سٹال کے مالک ہیں۔"

"علیم الدین!" اور غیاث بھیا یہ علیم الدین ہیں جو سٹال کا سارا کام سنبھال لیں گے، تم ان سے سارے کام کی تفصیل معلوم کر سکتے ہو، آمدنی یہ تمہارے حوالے کرکے جایا کریں گے، اور جس چیز کی ضرورت ہوگی لے آیا کریں گے۔ انہیں اس سلسلے میں خاصا تجربہ ہے!"

"ساری عمران کاموں میں گزری ہے صاحب، آپ، آپ بے فکر رہیں، میں سارے کاموں سے واقف ہوں!"

"ہاں، تمہاری تنخواہ کیا طے ہوئی ہے۔"

"صاحب سات سو روپے ماہوار، اور ہر سال اس میں سو روپے کا اضافہ لیکن اس شکل میں جب میں ہزار روپے کا منافع آمدنی میں کرکے دکھاؤں!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے غیاث سے کہا۔ اور غیاث نے بھی گردن ہلادی، وہ اس بک اسٹال کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا، اندازاً اس میں چالیس پچاس ہزار روپے کا تو صرف سامان بھرا ہوا تھا، دوکان کی قیمت الگ تھا، گویا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا مسئلہ تھا۔ جس کے بارے میں غیاث سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں خود بھی ان تمام چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ بہرصورت مجھے فوزیہ کی بات یاد آگئی تھی۔ علیم الدین نے بک اسٹال کھول لیا۔ غیاث تھوڑی دیر رک کر بک اسٹال کا جائزہ لیتا رہا، اس کی عجیب کیفیت تھی، کبھی اس کا چہرہ شدت مسرت سے چمک جاتا، اور کبھی اس پر فکر مندی کی تہہ جمنے لگتی تھی، تقریباً ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ واپس پلٹے، اور میں نے ان لوگوں سے اجازت چاہی۔ غیاث مجھے چھوڑنے جانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے معذرت کرلی۔

"نہیں غیاث بھیا، میں چلا جاؤں گا، تم کسی بات پر توجہ مت دو۔"

"گویا میں تمہیں چھوڑنے بھی نہ جاؤں۔" غیاث نے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، نا ہی وہ لوگ یہ بات پسند کریں گے، کیونکہ اس سے عدم اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔"

"کمال کی بات ہے، ٹھیک ہے بھیا، جیسی آپ کی مرضی، لیکن اب کب ملاقات ہوگی!"

"خط تو تمہیں لکھتا ہی رہوں گا غیاث، اور تمہاری خیریت بھی معلوم کرتا رہوں گا۔

"فوزیہ میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑی اور پھر مسرور لہجے میں بولی۔"

ارے میں نے تو تمہیں آتے دیکھا ہی نہیں۔"

"میں وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا ہوں فوزیہ!"

"بہت بہت شکریہ جناب کا، ویسے میں ٹھیک سات بجے پہنچ گئی تھی۔" اس نے اپنے برابر کا دروازہ کھول دیا اور میں اندر بیٹھ گیا، کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی، رخ گھر ہی کی طرف تھا۔" کیا رہا.... امی اور غیاث سے ملاقات ہوئی۔"

"ہاں!"

"وہ سب کچھ ان کے حوالے کر دیا!"

"ہاں فوزیہ، لیکن یقین کرو وہ مخلص لوگ اتنا کچھ مل جانے سے خوش نہیں تھے، بلکہ

متفکر تھے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو میرے لئے اتنا کچھ کر رہے ہیں' آخر ان کا مقصد کیا ہے!"

"تم نے کیا جواب دیا۔" فوزیہ کسی قدر گھبرا کر بولی!"

"کیوں کیا تمہارے خیال میں' میں انہیں حقیقت بتا دیتا۔"

"نہیں' میں بس پوچھ رہی تھی!"

"میں ان لوگوں سے اتنا ہی مخلص ہوں فوزیہ جتنا وہ مجھ سے۔ لیکن میں وعدہ خلافی کا عادی نہیں ہوں' تم سے جو وعدہ کیا ہے وہ اپنی جگہ ہے' میں کبھی کسی کو حقیقت نہیں بتاؤں گا!"

"میں تمہارے ظرف کی قائل ہوں سردار' نہ صرف میں بلکہ افضال صاحب اور دوسرے بھی!"

"ہاں فوزیہ' میں ایک معمولی سا انسان ہوں' لیکن وفاداریاں نبھانا جانتا ہوں!"

"تم یقین کرو ہماری ذات سے بھی تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی' پہلے ہم تمہیں مطمئن کر دیں گے' اس کے بعد ہم تم سے اپنے کام کے لئے کہیں گے' اب تم اس طرف سے مطمئن ہو گئے۔"؟

"ہاں' تمہارا شکریہ!"

"ٹھیک ہے آج تم سے دوسرے معاملے پر بات ہوگی!"

"دوسرا معاملہ۔" میں نے سوال کیا۔

"ہاں' ابھی تو تمہارے گاؤں بھی چلنا ہے' تمہارے والد اور بہنوں سے بھی تمہاری ملاقات کرائی جائے گی' تاکہ تم کسی خلش کے شکار نہ رہو!"

"کیا مطلب؟"

"یہ افضال صاحب کا منصوبہ ہے' دراصل افضال صاحب تم سے بڑی توقعات وابستہ کر چکے ہیں۔"

"تو پھر.....؟"

"ان کا خیال ہے کہ جب تم اپنے گھر اور دوسری چیزوں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو زیادہ دلجمعی سے ہمارے کام کی طرف توجہ دو گے۔"

"میں اب بھی تیار ہوں' اور تم میرے عمل میں کوئی کوتاہی نہیں پاؤ گی!" میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے' لیکن یہاں تو ایک دوسرے کے لئے ایثار کی بات ہے' افضال صاحب تم سے اتنے خوش ہیں کہ بیان سے باہر ہے' وہ تمہاری ضرورت کی ہر سہولت مہیا

کرا دینا چاہتے ہیں....“

”لیکن میں تمہارے ان احسانات کا بوجھ کس طرح اٹھاؤں گا فوزیہ!“

”لیکن اب تک تو صرف تم لوگ۔“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوہ۔ چھوڑو ان باتوں کو‘ ہاں یہ بتاؤ تم خوش ہو؟“

”ہاں فوزیہ بہت خوش‘ کم از کم ان لوگوں کو زندگی گزارنے کا سہارا مل گیا۔“

”تم یقین کرو سردار‘ زندگی بھر تم ان لوگوں کی مدد کرتے رہو گے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“ فوزیہ نے کار عمارت میں داخل کردی‘ اور پھر ہم دونوں اتر کر اندر آ گئے‘ عمارت میں حسب معمول ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”بیٹھو۔“ فوزیہ نے کہا اور میں اس کے سامنے پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔“ کل یہاں ایک خاتون آئی ہیں!“

”کون ہیں؟“۔ میں نے سوال کیا۔

”دیکھا تو میں نے بھی نہیں ہے‘ لیکن مس گریس کے نام سے مشہور ہیں‘ تمہیں ایک دقت پیش آئے گی سردار!“

”وہ کیا....؟“

”اب اس گھر میں تمہیں ہارون کے نام سے ہی مخاطب کیا جائے گا۔ یہ ضروری ہے‘ مس گریس کو یہ بات نہیں معلوم ہونی چاہئے کہ تم سردار ہو‘ ہارون نہیں!“

”ٹھیک ہے‘ اس میں دقت کی کیا بات ہے!“

”تمہیں الجھن نہیں ہوگی۔“

”الجھن کیوں ہوگی‘ ظاہر ہے آئندہ مجھے اس نام سے زندگی بسر کرنی ہے‘ اچھا ہے وقت سے پہلے عادت پڑ جائے!“

”اس کے علاوہ مس گریس تمہاری تربیت بھی کریں گی۔ تمہیں انگریزی بولنا سکھائیں گی‘ اور غیر ملکی آداب سے واقف کرائیں گی!“

”یہ کیوں۔؟“

”کیونکہ یہ ساری چیزیں تمہاری آئندہ زندگی کے لئے بہت ضروری ہیں‘ ظاہر ہے تم نے یورپ میں زندگی گزاری ہے‘ جہاں کے آداب و اخلاق سے واقفیت بھی ضروری ہوگی!“

”اوہ ٹھیک ہے‘ لیکن مجھے دقت تو نہیں ہوگی؟“

”ہرگز نہیں‘ تم جس قدر ذہین انسان ہو میں جانتی ہوں‘ مجھ سے زیادہ اس بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تو پھر کل سے شروع کرادیں تمہاری ٹریننگ۔“



”ہاں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اب دوسری بات ہو جائے ہارون۔“

”وہ بھی فرمائیے۔“ میں نے کہا۔ فوزیہ مسکرانے لگی۔

”ایمان سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم ایک اعلیٰ طبقے کے فرد نہیں ہو‘ میں تو تمہیں دیکھ کر مسرت سے دیوانی ہو جاتی ہوں!“

”خود کو سنبھالئے محترمہ‘ کیا فائدہ!“

”فائدہ تو بہت کچھ ہے‘ یہ بعد ہی میں پتہ چلے گا۔“ فوزیہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ ٹھیک ہے‘ ٹھیک ہے‘ مجھے بھی سب کچھ معلوم کرنے کی جلدی نہیں ہے‘ ہاں تو وہ دوسری بات کیا ہے۔؟“

”وہ ہارون۔ اب گاؤں کب چلو گے۔؟“

”فوزیہ!“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ اب میرے ساتھ اتنا بھی نہ کرو کہ میں شرمندگی سے گردن بھی نہ اٹھا سکوں۔“

"کیا مطلب ہے جناب کا؟"

"تم میرے لئے اتنا کر چکی ہو فوزیہ کہ سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ معاوضہ لے کر تو کوئی بھی کسی کے لئے کام کر سکتا ہے' میں نے کیا نیکی کی' بس اب میں کچھ نہیں چاہتا' اس کام کو انجام دینے کے بعد میں ان لوگوں کے لئے بھی کچھ کرلوں گا!"

"جی نہیں.... میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اب کوئی الجھن آپ کی تنہا الجھن نہیں ہے' میں برابر کی شریک ہوں۔ نہ صرف میں بلکہ دوسرے بھی' ہم تمہارے کسی بھی کام کو اپنا کام سمجھتے ہیں۔ اور یہ طے کر لیا گیا ہے کہ جب تک تم بالکل پرسکون نہ ہو جاؤ گے اور اس بات کا اعلان نہ کر دو گے کہ تمہارے ذہن میں کوئی الجھن کوئی تردد نہیں ہے' تمہیں اپنی کسی بات کے لئے آمادہ نہیں کیا جائے گا!"

"بڑی حیرت انگیز بات ہے!"

"کیوں حیرت انگیز کیوں ہے؟"

"میرا مقصد خدانخواستہ تمہاری نیت پر شک کرنا نہیں ہے' بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم لوگوں کے سوچنے کا انداز بھی کس قدر انوکھا ہے' سب کے سب ایک ہی انداز میں سوچ رہے ہو' تم اس شخص کے کتنے بڑے ہمدرد ہو' جو بے چارہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔"

"اوہ' وہ ہم سے الگ نہیں ہے ہارون۔" فوزیہ نے مجھے سردار کے بجائے ہارون کہنا شروع کردیا تھا!

"گویا.... گویا کوئی رشتہ بھی ہے۔؟"

"میں نے کہا نا ہر بات تمہیں آہستہ آہستہ معلوم ہوتی چلی جائے گی' وہ جو کچھ ہے تم اس پر بالکل حیرت نہیں کرو گے.... اس وقت جب تمہیں ساری تفصیلات سے واقفیت ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنے اصول کے خلاف پہلے سے کچھ بتاؤ!"

"یقین کرو ہارون کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو تم سے خصوصی طور پر چھپائی جائے' بس ایک عمل ہے' اور اس عمل کے تحت یہ کام ہو رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اب تم یہ بتاؤ کہ بستی کب چل رہے ہو۔؟"

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ بستی چل کر کیا کرو گی؟"

"تمہارے ابو سے ملاقات اور بہنوں کے لئے کوئی بندوبست ایسا بندوبست جو انہیں اچھی زندگی دیدے' تاکہ تم یہ محسوس کر لو کہ تم اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہو۔"

"لیکن فوزیہ کیا بہنوں کے لئے رشتے بھی آسانی سے مل جائیں گے۔" میں نے سوال کیا۔

"رشتوں کی بات نہ کرو' اچھی رہائش ہوگی' اچھا طرز زندگی ہوگا تو بہت سے لوگ راغب ہوں گے' تم یقین کرو یہ اس دنیا کا معمول ہے بہتر حالت کسی کی دیکھ لیں گے تو اس کی جانب دوڑ پڑیں گے' رشتے مل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوگی' صرف تمہیں مستحکم کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔" خدا کرے میں تمہارے ان احسانات کا تمہیں بھی کوئی اچھا صلہ دے سکوں!"

"دے کیا سکوں' تم دے رہے ہو ہارون تم نہیں سمجھتے' تمہارے مل جانے کے بعد ہم لوگ کتنے مطمئن اور پرسکون ہیں....۔"

"فوزیہ نے جواب دیا' اور میں خاموش ہوگیا۔

"غیاث سے ملاقات کے بارے میں مزید کوئی گفتگو نہ ہوئی' ویسے بھی یہ بات کچھ عرصہ پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ غیاث کو ایک مستقل اور مطمئن زندگی دینے کے بعد میں کچھ عرصے کے لئے ان سے قطعی طور پر جدا ہو جاؤں گا' یہ بات پہلے ہی میرے علم میں لائی جا چکی تھی' چنانچہ میں نے اس موضوع پر ان سے کوئی گفتگو نہیں کی' رات کے کھانے کے بعد فوزیہ حسب معمول چلی گئی' اور میں آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔

میرے ذہن میں بہت سے خیالات تھے' اب میں اپنے ابو اور بہنوں سے ملوں گا تو وہ میری اس حالت کو دیکھیں گے تو کیا انہیں بھی غیاث کی امی کی طرح اچنبا نہیں ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ میں کسی الجھن میں پھنس گیا ہوں۔ ویسے واقعی مشکل کام ہے۔ والدین خاص طور سے مطمئن نہیں ہوتے' اور غیاث اور اس کی امی بھی تو مطمئن نہیں ہوئے' وہ لوگ بھی تو مجھے اس قدر چاہتے ہیں۔

دوسرے دن میں اور فوزیہ ناشتے سے فارغ ہوکر بیٹھے تھے کہ ایک خاتون اندر داخل ہوئیں' نرم و نازک سی میم تھی' مغرب کا لباس پہنے' چشمہ لگائے' دودھ کی مانند سفید' میں نے کراچی میں ایسی کئی لڑکیاں یا عورتیں دیکھی تھیں۔ خاص طور سے اسٹور میں' وہ انگریزی بولتی تھیں' لیکن مس گریس نے اندر آکر کہا۔" میرا نام گریس ہے!"

"اوہ' مس گریس' آپ تو بہت عمدہ اردو بول لیتی ہیں۔" فوزیہ نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"بہت عمدہ نہیں بس ٹھیک' کام چل جاتا۔" گریس نے کہا۔

"میرا نام فوزیہ ہے' اور یہ ہارون ہیں!"

"بڑا خوش ہوا!" گریس نے میری طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا اور میں ایک لمحے کے لئے ہونق بن گیا۔ لیکن پھر میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا' ٹھنڈے اور نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ایک عجیب سا سرور محسوس ہوا تھا' میں نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا تو مس گریس معنی خیز انداز میں ہنس پڑی۔

"تشریف رکھئے مس گریس' آپ کیا پیئں گی؟"

"ویری تھینکس' تھوڑا دیر کے بعد کافی پیئں گا۔" مس گریس نے کہا اور اس پیئں گا پر بھی میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ "مجھے میرا روم مانگتا' آپ مدد کریگا۔؟"

"کیوں نہیں۔ ابھی آئی مسٹر ہارون!" فوزیہ نے کہا اور میں نے گردن ہلادی! مس گریس فوزیہ کے ساتھ چل پڑی' میں عقب سے اس حسین عورت کو دیکھ رہا تھا' بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

"پھر میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ ان لوگوں کے لئے میں ایک قیمتی کھلونے کی حیثیت رکھتا تھا' سب کو پسند تھا' سب مجھ سے دلچسپی رکھتے تھے' وہ شخص کتنا خوش نصیب ہوگا جس کی میں نقل تھا' لیکن بیچارہ جوانی کے عالم میں ہی مر گیا۔

فوزیہ واپس آئی تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔" دیکھا مس گریس کو۔"؟" س نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں مسکرا دیا۔

"ایک عرض تھی جناب۔" فوزیہ نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"حکم دیجئے!"

"کہیں اس گوری چمڑی پر نہ ریجھ جایئے' میرا مطلب ہے اس سے عشق بالکل نہیں کیا جائے گا' میں نگاہ رکھوں گی ہاں!"

"اس لئے کہ آپ کسی کی امانت ہیں۔"

"اوہ۔ امانت بھی ہو گیا' مگر کس کی۔؟"

"میری!" فوزیہ نے کہ اور شرما گئی' اس نے گردن جھکالی۔ اس طرح شرماتی ہوئی فوزیہ مجھے عجیب لگی' بہت عجیب بہت پیاری' لیکن میں کھو سا گیا تھا' کیا یہ زندگی اپنی ہوئی' مجھے تو صرف ایک شخص کی نقل کرنی ہے۔ اصل تو میں بن نہیں سکتا' کبھی نہ کبھی ضرور سامنے آ جائے گی' کم از کم اس وقت جب ہارون کا راز کھل جائے گا اور بڑے میاں ٹھیک ہو جائیں گے!"

"کیا سوچنے لگے!" فوزیہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!"

"جھوٹ بول رہے ہیں جناب!"

"نہیں فوزیہ سچ مچ کوئی خاص بات نہیں!"

"عام بات ہی سہی!"

"ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ زندگی دائمی ہوگی' میرا مطلب ہے ہارون کی زندگی' کبھی نہ کبھی تو مجھے اپنی دنیا میں لوٹنا پڑے گا۔"

"دنیا کوئی بھی ہو ہارون' اگر تم پسند کرو گے تو میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گی' آنے والا وقت ہمارے لئے بہت کچھ لائے گا ہارون' یقین کرو بہت کچھ لائے گا!" فوزیہ جذباتی ہو گئی!

جب فوزیہ ایسی باتیں کرتی تھی تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں اس سے منحرف بھی نہیں تھا' لیکن اس بات کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے دل بھی نہیں چاہتا تھا' بس ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا' جیسے کوئی طلسمی خواب دیکھ رہا ہوں' ایک انوکھا خواب!

"کیوں میری بات کی حقیقت کو پرکھ رہے ہو۔؟" فوزیہ نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں فوزیہ.... یہ بات نہیں ہے!"

"پھر؟"

"بس سوچ رہا تھا کہ نہ جانے آئندہ زندگی کیسی گزرے۔ یہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔"

"بعض خواب خود اپنی تعبیر بھی ہوتے ہیں!"

"سمجھ جاؤ گے' چھوڑو ان باتوں کو.... وہ.... وہ مس گریس آ رہی ہیں۔" اس نے کہا' مس گریس ہمارے پاس پہنچ گئی' اور فوزیہ نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی۔

"شکریہ' میں کافی پینا مانگتا۔"

"ابھی منگواتی ہوں۔" فوزیہ نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی' تب مس گریس نے مجھے ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"مسٹر ہارون۔ اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔" آپ کا مزاج کیسا ہے!

"ٹھیک ہوں مس گریس۔"

"آپ بہت ہینڈسم مین ہے' میں آپ کو پسند کیا۔ ابھی میں آپ کا استاد.... استاد ٹھیک ہے نا۔؟"

"بالکل ٹھیک ہے!"

"کل سے ٹریننگ شروع.... ٹھیک ہے؟"

"جی۔" میں نے جواب دیا۔

"مس فوزیہ.... آپ کا کزن.... آئی مین.... میرا مطلب ہے وہ؟"

"جی ہاں.... آپ کا خیال درست ہے مس گریس' میں ان کی کزن ہوں۔" فوزیہ کی آواز سنائی دی!

"اوہ۔ مجھے معلوم ہے' بس مسٹر ہارون کو بے تکلف کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ میرے کو گفتگو کرلے' میرا بات سمجھے!"

"اور ضرور.... ضرور لیکن پہلے کافی پی لی جائے' اور پھریوں بھی آج تو آپ آرام کریں گی' کل سے آپ کا کام شروع ہوگا!"

"ہاں بالکل.... بالکل....۔" مس گریس نے کہا' اور پھر ملازمہ کی طرف دیکھنے لگے جو کافی لا رہی تھی' ملازمہ نے کافی بنا کر ہم تینوں کو سرو کر دی اور کافی پیتے ہوئے مس گریس نے کہا۔

"آپ میری مدد کرینگا مس فوزیہ؟"

"کس سلسلہ میں گریس؟"

"ابھی دو تین روز تک آپ ہمارے ساتھ رہیں گا' اس کے بعد ہم اپنا ٹریننگ اسٹارٹ کریں گا!"

"جیسا آپ پسند کریں مس گریس' لیکن اس کے اوقات کیا ہوں گے!"

"اوکاٹ۔!"

"میرا مطلب ہے ٹائمنگ!"

"اوہ.... ہاں ٹھیک.... صبح سے دوپہر تک.... پھر رات کو.... ٹھیک ہے نا۔!"

"جی۔" فوزیہ نے کہا' لیکن میں نے ایک بات محسوس کی تھی' فوزیہ مس گریس کی بے تکلفی سے زیادہ خوش نہیں تھی' اور شاید وہ اس کی خوبصورتی سے بھی ناخوش تھی' اور اس کی وجہ بہرحال میں سمجھ گیا تھا۔

لیکن دل ہی دل میں اس کھیل سے زیادہ محظوظ نہیں ہو رہا تھا' کیونکہ تماشا تو میں خود تھا' بہرحال قصہ مختصر دوسرے دن سے میری تربیت شروع ہوگئی' فوزیہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔

"یوروپ کا لائف....میں....لڑکی....لڑکے سے بالکل بے تکلف ہوتا' ایک دم نرمی' کیوں بات کرتا' آپ بھی ایسا کرو مسٹر ہارون۔"

"کس طرح؟"

"جیسا میں.... تمہارا گرل فرینڈ.... مس فوزیہ.... تم اس کو ڈارلنگ بولو' یہ تم سے.... ایسا موافق.... تم اس کو پورا ہائے ڈارلنگ.... ہاؤ آر یو.... پھر اس کا کمر میں ہاتھ ڈال کر سے کس کرو۔ بالکل بے تکلفی کا مافق۔"

"فوزیہ۔" میں نے فوزیہ کو دیکھا۔

"یہ ضروری ہے مس گریس؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہاں ڈیئر' جو ڈیوٹی میرے کو دیا گیا ہے' میں وہ ضرور پورا کرینگا' پلیز میرا ہیلپ کرو!"

"اس سے کہونا' فوزیہ نے کہا۔ اور گریس مجھے سمجھانے لگی پھر اس نے فوزیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چوما اور مجھ سے بھی ایسا کرنے کے لئے کہا' بڑا کٹھن مرحلہ تھا' لیکن بہرحال مجھے اس مرحلے سے گزرنا پڑا' فوزیہ شرم سے سرخ ہوگئی تھی' مجھے دو تین مرتبہ یہ عمل دہرانا پڑا' تب جا کر میں "فٹ" ہو سکا' لیکن فوزیہ ان فٹ ہوگئی تھی اور مس گریس اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"اس کے بعد مس گریس نے مجھے اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے اور دوپہر تک اس شغل میں مصروف رہا' میں واقعی خود کو الو کا پٹھا سمجھ رہا تھا' جو دو عورتوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔

"آج کا کام ختم' اب کس وقت ملاقات ہوئیں گا!"

"شام کو سات بجے۔" فوزیہ نے کہا۔

"اوکے' ہمیں اجازت۔!" مس گریس باہر نکل گئی' فوزیہ شرماتی ہوئی نگاہیں سے مجھے دیکھ رہی تھی' پھر اس نے شرماتے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ مس گریس بے حد ذہین عورت معلوم ہوتی ہے!"

"نہیں ایسی تو نہیں' اس کی دی ہوئی تربیت مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے شرارت سے کہا اور فوزیہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"تم بے حد شریر ہوتے جا رہے ہو ہارون!"

"جب ہارون بنا ہوں تو یورپ رٹرن بننا ہی پڑے گا' تم کہو تو کوئی تربیت نہ لوں' مس گریس سے؟" میں نے کہا۔

"نہیں' یہ بھی ضروری ہے۔" فوزیہ نے جواب دیا اور میں خاموش ہوگیا' کئی روز گزر گئے' مس گریس کی ٹریننگ جاری تھی' لیکن اس دن کے بعد سے اس نے کوئی ایسا سبق نہیں دیا جس کی وجہ سے فوزیہ کو سرخ ہونا پڑتا' مس گریس مجھے لباس پہننے کے

آداب' اٹھنے بیٹھنے کے طریقے اور انگریزی کے مخصوص الفاظ اور ان کی مشق کرا رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے مجھ سے ایک کاغذ پر دستخط کرائے' اس کے پاس دستخطوں کے نمونے تھے۔

لیکن میں نے اپنے سیدھے دستخط کئے تھے' لیکن مس گریس کئی گھنٹوں تک مجھ سے ویسے ہی دستخط کراتی رہی' جیسے کاغذ پر تھے' ایک دن میں وہ کام ناممکن تھا' چنانچہ اس نے فوزیہ سے کہا۔

"اس کام میں کئی دن لگ جائیں گے!"

"ظاہر ہے' آسان کام نہیں ہے!"

"تو پھر پہلے ہی عرصہ طے کر لیا جائے۔" گریس بولی۔ اور فوزیہ نے گردن ہلادی!"



"اس دن صبح کے ناشتے پر فوزیہ نے کہا۔" ہارون۔ آج مجھے چند کام کرنے میں، اس کے بعد ممکن ہے دو ایک روز میں ہم تمہاری بستی چلیں۔"

"اوہ کیا کام کرنے میں۔؟" میں نے پوچھا۔

"بس افضال صاحب نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔ ویسے ممکن ہے میں دوپہر تک پہنچ جاؤں لنچ پر ایک بجے تک انتظار کرنا پھر کھانا کھا لینا۔"

"اوکے۔" میں نے مخصوص انداز میں کہا اور فوزیہ مسکرادی۔ پھر وہ تیار ہوا اور مجھے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی، اور میں ایک آرام کرسی میں دھنس کر انگریزی رسالہ دیکھنے لگا، اس میں تصویروں کی مدد سے یورپ کی زندگی دکھائی گئی تھی۔ بہت دلچسپ رسالہ تھا،

اس لئے مجھے مس گریس کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

"ہیلو ڈارلنگ۔؟" اچانک اس نے کہا، اور میں چونک پڑا۔ رسالہ نیچے گر گیا تھا۔ مس گریس ہلکے نیلے رنگ کے حسین لبادے میں ملبوس تھی اور اس کے کھلے ہوئے بال لہرا رہے تھے، بے حد حسین لگ رہی تھی وہ اس لباس میں، وہ جلدی سے رسالہ اٹھانے کے لئے جھکی اور اس کا سر میرے گھٹنوں پر آ ٹکا، مس گریس نے رسالہ اٹھا لیا تھا!

"فوزیہ کہاں گیا....؟" اس نے پوچھا۔

"کام سے گئی ہے، لنچ پر آ جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر آج کا سبق۔؟"

"کیا فوزیہ کی موجودگی ضروری ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو.... مجھے تو بالکل پسند نہیں، بس وہ خود ہمیں ڈسٹرب کرتی ہے، میں کیا کروں تم خود اسے منع کردو۔"

"حرج بھی کیا ہے، ویسے اگر آپ پسند نہیں کرتیں تو اسے خود منع کردیں۔" میں نے کہا۔

"اوہ نہیں یہ کام میں نہیں کر سکتی، مگر یہ ضرور ہے، کم از کم اس وقت جب میں تمہیں ٹریننگ دے رہی ہوں!"

"میں بات کرلوں گا۔" میں نے کہا اور گریس کسی سوچ میں ڈوب گئی، پھر اس نے کہا۔

"نہیں تم بھی مت کرو، میں مسٹر افضال سے بات کروں گا۔"

"اوکے اوکے۔" میں نے گردن ہلائی۔

"اوکے، ونڈر فل، بہت اچھا کیا تم نے اوکے اوکے۔"

"سارا باتیں یاد ہے تمہیں۔؟" گریس نے پوچھا۔

"ہاں مس گریس سب کچھ یاد ہے۔"

"پوچھوں؟"

"پوچھ لیں!"

"اچھا تو بتاؤ جب تم اپنی گرل فرینڈ سے ملے گا تو کیسے ملے گا۔" مس گریس نے پوچھا۔

"میں اس سے کہوں گا، ہیلو ڈارلنگ ہاؤ آر یو!"

"اوہ نو، نو۔ پورا سین بتاؤ۔" مس گریس نے کہا اور ایک لمحے کے لئے میرے اندر جھجک سی پیدا ہوئی، لیکن یہ یورپین لڑکی جو چاہتی تھی وہ بھی برا نہیں تھا، پورا سبق

دوہرانے کا مقصد یہی تھا کہ میں عملی طور پر بھی وہی سب کچھ کر کے دکھاؤں جو اس نے مجھے سکھایا ہے' چنانچہ میں چند قدم آگے بڑھ کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"ہیلو ڈارلنگ' ہاؤ آر یو....." میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور خود سے نزدیک کر کے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ گریس کے بازو میری گردن میں حائل ہوگئے تھے' جبکہ فوزیہ کو اس نے یہ تربیت نہیں دی تھی' بوسہ خاصا طویل ہوگیا' گریس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں سکڑ گئی تھیں' وہ کچھ بہکی بہکی سی نظر آنے لگی تھی' تب اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "تھینک یو ڈارلنگ' تھینک یو۔"

"کیا خیال ہے مس گریس مجھے اپنا سبق یاد ہے؟"

"ہاں!" وہ مسکرا کر بولی' پھر کہنے لگی۔" لیکن افسوس میں یہ سبق فوزیہ کے سامنے روزانہ نہیں دوہرا سکتا۔"

"آپ چاہتی ہیں۔؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا' اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔" میں' میں اس کی موجودگی بالکل برداشت نہیں کر سکتی مسٹر ہارون' لیکن کوئی بات نہیں' میں مسٹر افضال سے کہہ کر یہ کام بھی کر سکتا ہوں' لیکن تمہیں ناگوار تو نہیں ہوگا۔؟"

"نہیں مس گریس' ظاہر ہے آپ اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں گی.....!"

"ہاں میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔"

"آخر کیوں۔؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے مسٹر ہارون کہ میں بھی تمہیں کو پسند کرنے لگا ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

"اوہ' اوہ۔" میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔ لیکن بہرصورت میں نے اس مسکراہٹ کو دبا لیا۔ "تو ٹھیک ہے مس گریس آپ مسٹر افضال سے بات کرلیں مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تھینک یو ڈارلنگ' تھینک یو' ویسے آج ایسا کرو' کہ آج کا سبق ملتوی کر دیا جائے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی باتیں کریں گے۔" گریس بولی' اور میں دونوں شانے اچکا کر خاموش ہوگیا۔

"مسٹر ہارون حالانکہ مجھے یہاں آئے زیادہ دن نہیں گزرا' بٹ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے تمہارے ساتھ بہت ٹائم گزر گیا۔ میں تمہیں ٹریننگ دینے ادھر آیا' بٹ یوں لگتا

ہے جسے میں کوئی بڑا نقصان اٹھا چکا ہوں!"

"کیا نقصان مس گریس؟" میں نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"بس ڈیئر' میں نہیں جان سکا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔"

"تعجب ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ یورپین لڑکیوں کو اتنی آسانی سے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"کیوں یورپین لڑکی انسان نہیں ہوتا۔" گریس نے پوچھا۔

"ہوتا تو ہے' بلکہ بہت زیادہ ہوتا ہے!"

"تو پھر تم ایسا بات کیوں بولتا' مسٹر ہارون' کیا یہ نہیں ہونے سکتا کہ تم ہمارے ساتھ یورپ چلو یار پھر ہمیں اپنے ساتھ رہنے کا اجازت دے دو' بس ہم عجیب سے خیالات کا شکار ہوگیا ہے۔"

"میں تو یہ بھی نہیں جانتا مس گریس کہ آپ مجھے کتنے عرصے تک تربیت دیں گی' اور اس تربیت دینے کے لئے آپ کو کیا بتایا گیا ہے۔ مسٹر افضال سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں' کیا اس سلسلے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گی۔"

"اوہ۔" گریس جیسے کسی خواب سے چونک پڑی۔ چند ساعت سراسیمہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ایک دم ہنس پڑی۔' لیکن اس کی ہنسی بالکل کھوکھلی تھی۔" نہ جانے مجھے کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔ بڑا تعجب ہے' میں کیا کہہ رہا تھا تم سے۔؟"

"آپ کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی ساتھ یورپ چلوں!"

"ہاں' ہاں' کیا حرج ہے' ایک دوست اپنے دوسرے دوست کو کیا اپنے ملک میں مدعو نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے!"

"بس تو اس طرح کبھی یورپ آنا ہو مسٹر ہارون تو آپ ضرور مجھ سے ملئے۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے شانے اچکائے!

"جیسا آپ پسند کریں۔" ویسے میں نے محسوس کیا تھا' جیسے مس گریس اچانک کسی خواب سے چونک پڑی ہو۔ اسے احساس ہوگیا ہو کہ اب تک وہ جو کچھ کہتی رہی ہے وہ غلط ہے' اور کسی بھی طور اس کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے' لیکن اس سے سب کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

اس کے بعد مس گریس سنبھل گئی اور وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس نے آج ٹریننگ نہ دینے کے خیال کا اظہار کیا تھا۔

لنچ سے پہلے فوزیہ واپس آگئی' مس گریس اپنا کام ختم کر کے واپس جا چکی تھی' فوزیہ

نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر ایک دم مسکرادی۔ "ہیلو ہارون، ٹریننگ ختم ہوگئی۔؟"

"ہاں!"

"اور کوئی خاص بات تو نہیں کہہ رہی تھیں مس گریس۔؟"

"کوئی خاص بات تو کوئی نہیں، بس وہی اپنی تربیت۔" مس گریس کی بات چھپا گیا، اپنے طور پر میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ فوزیہ مطمئن ہوگئی۔

"تیار ہو جایئے مسٹر ہارون، اب آپ کو اپنی بستی جانا ہے، میرا خیال ہے افضال صاحب آج رات آپ سے ملاقات کریں گے؟"

"اوہ، خوب، آپ نے اجازت لے لی ہے!"

"ہاں۔"

"ویسے کیا آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی مس فوزیہ!"

"آپ کی کیا رائے ہے!"

"کوئی حرج تو نہیں تھا، لیکن میری بستی کے لوگ فرسودہ خیالات کے مالک ہیں، آپ کو تماشا بنالیں گے، اور میرے بارے میں طرح طرح کی افوائیں اڑائیں گے، ممکن ہے یہ افوائیں میرے لئے نقصان دہ ہوں۔"

"تو میں نہیں جاؤں گی!" آپ کو کوئی تعرض تو نہیں ہوگا۔

"تعرض کی بات نہیں ہے۔ بس تم سے دور رہنے کا افسوس ہے لیکن بہرحال یہ کام بھی ضروری ہے، تاکہ تم اس مرحلے سے بھی نکل آؤ، ویسے کوئی نہ کوئی تو تمہارے ساتھ ضرور جائے گا!"

رات کے کھانے پر افضال صاحب موجود تھے، میں جس وقت کھانے کے لئے کمرے میں پہنچا تو مس گریس اور مسٹر افضال صاحب گفتگو کر رہے تھے، فوزیہ اور میں اندر داخل ہوئے تو دونوں خاموش ہوگئے۔ افضال صاحب کھڑے ہوگئے تھے۔

"ہیلو مسٹر ہارون، کیسے ہیں آپ!"

"فائن!" میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر خاص انگلش طرز پر اس کی خیریت پوچھی اور افضال صاحب بے حد خوش نظر آنے لگے فوزیہ نے مجھے ایک خوبصورت سوٹ پہنایا تھا اور افضال صاحب باربار مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے گردن ہلائی۔ اور بولے

"واہ فوزیہ، تم نے اور مس گریس نے مل کو جو محنت کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے!"

"شکریہ مسٹر افضال۔" فوزیہ نے کہا۔

"اچھا اب کھانا کھایا جائے، اس کے بعد میں مسٹر ہارون سے گفتگو کروں گا!" افضال نے کہا۔ کھانے کے دوران بھی وہ میرا جائزہ لے رہے تھے، اور شاید پورے طور سے مطمئن تھا، کھانے کے بعد اس نے دوسرے لوگوں سے معذرت کرلی اور میرے ساتھ ایک کمرے میں آگیا۔

"بیٹھئے سردار صاحب، میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا نام بھی آپ سے چھین لیا۔"

"اس کے عوض تو آپ نے مجھے بہت کچھ دیدیا ہے مسٹر افضال۔ جس کے لئے میں آپ کا شکریہ بھی نہیں ادا کا کر سکتا۔"

"فوزیہ نے آپ کو ہماری الجھن کے بارے میں بتا دیا ہوگا آپ ہماری جس مشکل کا حل ہیں اس کے سامنے آپ کی یہ چھوٹی سی خدمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔" افضال نے کہا۔

"بہرحال میں آپ سے پورے پورے تعاون کا خواہش مند ہوں۔"

"اور ہم آپ کے بہت بہت شکرگزار۔ یہ تو رسمی سی باتیں ہیں مسٹر سردار یا ہارون صاحب، اب میں اس مسئلے پر بات کر رہا ہوں جس کے لئے آیا ہوں، میری دلی خواہش ہے کہ پہلے ہم آپ کو ذہنی طور پر پوری طرح مطمئن کردیں تاکہ اس کے بعد آپ کو کوئی فکر لاحق نہ رہ جائے، اور آپ یہ محسوس کریں کہ جن لوگوں کے لئے آپ ایثار کر رہے ہیں، وہ آپ کی ذات سے منحرف نہیں ہیں، بلکہ آپ کے بھی اتنے ہی محب اور خیرخواہ ہیں، جتنے آپ ان کے۔ آپ اس کوشش میں ہمارے معاون ہیں، اس شخص کے لئے جو صدمے سے اپنی ذہنی کیفیت خراب کر بیٹھا ہے، ہم اسے کسی طور اس صدمے سے نہیں نکال سکتے، لیکن آپ کے مل جانے کے بعد ہمیں ان مشکلات کا ایک خوبصورت حل مل گیا ہے، تو ہارون صاحب اب میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بستی ہو آئیں، اپنے والدین بہنوں سے ملیں، اور بغیر کسی تکلف کے میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ اپنی بہنوں کی شادی کے سلسلے میں آپ کو جتنی بھی رقم کی ضرورت ہو آپ وہ انہیں فراہم کردیں، والد صاحب کو اس طرح مطمئن کردیں کہ وہ بقیہ زندگی آرام سے گزار سکیں، اس کے بعد آپ ہمارے پاس واپس آجائیں، تب ہم آپ کو اس مشن پر لے جائیں گے، اور ہارون صاحب اس کی تکمیل کے لئے ایک طویل وقت بھی درکار ہو سکتا ہے، ہاں اس کام کی تکمیل کے بعد آپ آزاد ہوں گے، چاہیں تو ہمارے ساتھ ہی قیام کریں، یا پھر اپنے طور پر زندگی گزارنے کا بندوبست کریں۔ اس وقت بھی ہم آپ کی بھرپور امداد کریں گے۔"

میں افضال کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور دل ہی دل میں اس سے بہت متاثر تھا' تب میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"افضال صاحب آپ لوگوں نے میرے اوپر جو احسانات کئے ہیں' میں انہیں تاحیات نہیں بھول سکوں گا' میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ان احسانات کا آپ کو پورا پورا ہ ۔ دوں' میرے ذہن میں یہ بات پوری طرح ہے کہ آپ مجھے ایک نیک مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں' اور میں اس کے لئے بخوشی تیار ہوں' اگر آپ مجھے اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیتے تب بھی بخدا آپ یقین کریں' یہ میرا فرض تھا کہ میں آپ کی خدمت کروں' لیکن بہرصورت اگر آپ نے مجھے اتنی آسانیاں فراہم کر دی ہیں تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں' میں تیار ہوں' باپ اور بہنوں سے مل لوں' اس کے بعد میں آپ کی خدمت میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا!"

"یقیناً یقیناً' تو پھر آپ کب جانا پسند کریں گے۔" افضال نے پوچھا....

"جب آپ مناسب خیال فرمائیں!"

"میری طرف سے مکمل اجازت ہے' بلکہ ہمارا ایک آدمی آپ کے ساتھ جائے گا' آپ اسے کسی بھی حیثیت سے روشناس کرا سکتے ہیں' وہاں پہنچ کر آپ اپنے حالات اور ضروریات کا جائزہ لے کر جتنی رقم کی آپ کو ضرورت ہو اس شخص سے کہہ دیں' بلکہ ایسا کریں کہ ایک بڑی رقم آپ یہاں سے لے جائیں' مزید رقم کی ضرورت ہو تو اس شخص سے منگوائیں!"

"بہت مناسب!" میں نے جواب دیا' اور افضال مسکرانے لگا۔

"اس کے علاوہ اور کوئی بات۔؟"

"نہیں میرا خیال ہے سارے کام تسلی بخش ہو رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جو تربیت ہو رہی ہے آپ کی اس پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔؟"

"اعتراض کا کیا سوال ہے' ظاہر ہے ایک ضرورت ہے مجھے پورا کرنا ہے۔"

"ان دونوں خواتین سے کوئی شکایت؟"

"نہیں بہت اچھے لوگ ہیں' انتہائی مہربانی سے میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی اور تکلیف آپ کو۔؟"

"قطعی نہیں' میرا خیال ہے آپ یہ بات نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔"

"بس میں یہی چاہتا ہوں ہارون صاحب کہ آپ ہمارے ساتھ دل کی گہرائیوں سے



تعاون کریں' اس لئے ہم ہر قسم کا تعاون آپ سے کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ ذہنی طور پر ہمارے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں' اچھا خدا حافظ...." افضال صاحب نے کہا اور میں نے بڑے خلوص سے ان کے ساتھ مصافحہ کیا' پھر وہ میرے ساتھ باہر نکل آیا' لڑکیوں سے ملا اور چلا گیا' فوزیہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آ گئی تھی۔

"کیا معاملات طے ہوئے۔" اس نے پوچھا۔

"بس وہی باتیں' افضال صاحب کا خیال ہے کہ میں بستی جا کر اپنے لوگوں سے مل لوں' بڑے مہربان انسان ہیں!"

"آپ نے کیا جواب دیا۔"

"بس طے کر لیا ہے کہ بستی چلا جاؤں!"

"تنہا جائیں گے؟"

"نہیں کوئی اور بھی ساتھ جائے گا۔"

"کتنے دن رہو گے وہاں۔"

"زیادہ دن نہیں' مجھے تمہارا بھی خیال ہے۔" میں نے فوزیہ سے کہا' اور وہ مسکرانے لگی' مس گریس البتہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی' مجھے یہ سارے معاملات بہت دلچسپ نظر آتے تھے۔ بہرحال تیسرے دن بستی جانے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔

اور پھر بذریعہ ٹرین میں بستی کے لئے روانہ ہو گیا' ایک طویل عرصہ کے بعد بستی کی طرف سفر کرتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا' میرا دل نہ جانے کیسے کیسے احساسات کا شکار تھا' سب یاد آ رہے تھے۔ باپ' بہن' دوست احباب اور نہ جانے کیا کیا۔

خیالات کے ہجوم میں گھرا رہا اور بڑی مشکل سے ٹرین کا سفر ختم ہوا' ایک شخص میرے ساتھ تھا' جس کا نام اعظم بتایا گیا تھا' اعظم میرے سامنے بے حد مودب رہتا تھا' میں نے راستے میں اسے ہدایت کر دی کہ بستی میں مجھے سردار کے نام سے مخاطب کرے۔

ظاہر ہے یہ اعتماد کا آدمی تھا ورنہ افضال صاحب اسے میرے ساتھ کیوں بھیجتے۔



"اسٹیشن پر اتر کر میں نے بستی کے لئے تانگہ کیا اور تانگہ کچے راستے پر چل پڑا' دل کھنچ رہا تھا' جانے پہچانے راستے جہاں میرے خمیر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ سفر بھی طے ہوا اور میں بستی میں داخل ہوگیا۔

"کرم علی کے اینٹوں کے بھٹے' پھر میں نے کرم علی کو دیکھا جو اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کام میں مصروف تھا' فاصلہ کافی تھا اس لئے سلام دعا نہ ہو سکی' وہی ماحول وہی سب کچھ۔

تانگہ میرے بتائے ہوئے راستوں پر سفر کرتا ہوا میرے گھر کے سامنے پہنچ گیا' کسی

نے مجھے نہیں پہچانا تھا لیکن جب میں گھر کے سامنے اترا تو مجھے میرے والد نظر آئے جو گھر سے باہر نکل رہے تھے۔

میں تانگہ سے اتر کر ان کی طرف لپکا' اور دوسرے لمحے انہوں نے مجھے پہچان لیا' ہم دونوں گلے لگ گئے تھے' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی' ویسے مجھے اپنا گھر بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔

تانگے والے کو اعظم نے پیسے دے دیئے' میں نے ابا سے کہا کہ میرے ساتھ آنے والے کے لئے انتظام کیا جائے' اور پھر میں اندر داخل ہو گیا' میری دونوں بہنوں کو بھی شاید آواز پہنچ گئی تھی۔ دونوں دوڑتی ہوئی آئیں اور میرے نزدیک پہنچ کر ٹھٹھک گئیں۔

"ارے رک کیوں گئیں۔ آؤ۔ میں نے کہا اور دوسرے لمحے دونوں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں بڑی عجیب کیفیت تھی' سب میری حالت دیکھ کر حیران تھے۔

والد صاحب نے مہمان کے لئے ڈیوڑھی میں بندوبست کر دیا اور اس کے بعد اندر آ گئے' انہوں نے مجھے خوب پیار کیا تھا' بہنیں بھی نثار ہوئی جا رہی تھیں اور پھر پاس پڑوس کے لوگ آنا شروع ہوگئے گھر میں رونق ہوگئی تھی' بہنوں نے جلدی جلدی کپڑے بدل لئے تھے' کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں' ملنے والے دعائیں دے رہے تھے۔ سوالات ہو رہے تھے' میری ترقی پر مبارکباد دے رہے تھے۔ سوالات کر رہے تھے' مشورے دے رہے تھے اور ہم ان کی سن رہے تھے' معصوم لوگ معصوم معصوم باتیں' رات کو بہت دیر کے بعد مجھے اور ابا کو تنہا بیٹھنے کا موقع ملا تھا اور دونوں بہنیں بھی ہمارے پاس تھیں' وہ میری صورت سے نگاہیں نہیں ہٹا رہی تھیں۔

"ہاں بیٹے اب بتاؤ 'کیا کر رہے ہو شہر میں؟"

"کئی نوکریاں کیں ابا جی' لیکن اس بار جو ملازمت ملی ہے بہت شاندار ہے' بہترین تنخواہ اور کمیشن۔" میں نے اپنے والد کو بھی حقیقت بتانا پسند نہیں کیا تھا۔ راز کی بات تھی راز ہی رہتی تو زیادہ بہتر تھا اور میں اس کا وعدہ کر چکا تھا۔

"کام کیا کرنا ہوتا ہے؟"

"بس ابا غیر ملکی مال کی سپلائی کرنا ہوتی ہے' زیادہ تر کراچی سے باہر جانا پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ بعض اوقات ملک سے باہر بھی جانا ہوتا ہے۔"

"اوہو بہت بڑا کام ہے۔"

"ہاں ابا بہت بڑی آمدنی ہے' ابھی ابھی نوکری لگی ہے۔ میں نے سوچا کہ باہر جانے سے پہلے آپ لوگوں سے مل لوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' تو بیٹے باہر کہاں جاؤ گے۔" ابا جی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ابھی نہیں معلوم ابا جی کہ کہاں جانا پڑے' لیکن عام طور سے لندن' امریکہ اور پیرس وغیرہ۔" میں نے جواب دیا' اور میرے ابا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں ابا جی' بس آپ کی دعائیں ہیں' پڑھ لکھ بھی لیا ہے کچھ۔" میں نے کہا اور میرے ابا جی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"اچھا اچھا اتنا جلدی؟"

"ہاں ابا جی' بس تھوڑا بہت کام چل گیا ہے۔" میں نے کہا نے آپ کی دعائیں شامل رہیں تو اس سے بھی زیادہ ترقی کروں گا!"

"آمین' امین' مگر مجھے حیرت ہے' بڑی مہربانی کی ہے چوہدری صاحب نے ہمارے اوپر کہ تمہیں کراچی بھجوا دیا' یہ ان کا احسان ہے ہمارے اوپر ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے۔"

"یقیناً ابا جی' ویسے چوہدری صاحب کیسے ہیں' میں کل صبح ان سے ملنے جاؤں گا!"

"ضرور بیٹے' چوہدری صاحب ٹھیک ہیں' ویسے انسان کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے اسے اپنے محسنوں کو نہیں بھولنا چاہئے۔ تم انہیں سلام کرنے ضرور جانا!"

"بے شک میں کل صبح سب سے پہلے چوہدری صاحب کے پاس جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا' اور پھر والد صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "گھر کے حالات کیسے چل رہے ہیں ابا جی؟"

"بیٹے تم نے تو ہمیں اتنے پیسے بھیج دیئے کہ ہمارے سارے دلدر دور ہوگئے۔ چوہدری صاحب کی ساری رقم ادا کردی گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی اور اس دوکان سے اللہ کھانے پینے کو دیتا ہے۔ اچھی خاصی چل رہی ہے' بس اب بچیوں کا مسئلہ ہے۔"

"واہ یہ تو بڑا اچھا کیا آپ نے اباجی' بس اب ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ ہے۔" میں نے بہنوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کئی جگہ سے رشتے آ رہے ہیں بیٹے' دراصل ہمارے حالات اچھے ہوگئے ہیں نا۔ ویسے بیٹے ابھی اتنے اچھے حالات نہیں ہوئے ہیں کہ ہم آسانی سے ان دونوں کی شادی کردیں۔"

"نہیں ابا حالات اچھے ہو چکے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مقصد یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ ان دونوں کو اس گھر سے نکالیں۔" میں نے کہا اور دونوں بہنیں باہر نکل گئیں!

"ارے ارے، بھاگی کہاں تم دونوں، اب گھر میں رہ جاؤ تو جانوں۔" لیکن وہ دونوں اب نہیں رکی تھیں!

"کہاں کہاں سے رشتے آئے ہیں ابا جی، کوئی اچھا رشتہ بھی ہے۔؟"

"ہاں بیٹے، چوہدری حمید اللہ اپنے دونوں بیٹوں کے لئے رشتہ مانگ رہے ہیں دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں چلی جائیں گی۔ ویسے تو سعید الدین صاحب نے بھی اپنے ایک بیٹے کا رشتہ بھیجا ہے، لیکن حمید اللہ سے ہماری پرانی دوستی ہے، جیسے لوگ ہیں تمہیں معلوم ہے، ان کے دونوں بیٹے بھی اچھے کھا کما رہے ہیں۔"

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے ابا۔" پھر آپ نے کیا سوچا۔"

"تمہارے بغیر میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لئے میں نے ٹال دیا ہے۔"

"بات کرلیں گے ابا!"

"مگر بیٹے، انتظامات بھی تو کرنے ہوں گے، میرا مطلب ہے بہنوں کو رخصت کرنے کے لئے!"

"کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی ابا، ویسے میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میں تو اب عموماً باہر رہوں گا، ممکن ہے بہنوں کی شادی پر بھی نہ پہنچ سکوں، ویسے کوشش تو کروں گا۔ نوکری، نوکری ہے۔"

"ہاں بیٹے، میں جانتا ہوں، اس دنیا میں ترقی کرنے کے لئے سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔"

"یہی بات ہے، ہاں تو ابا جی، تیس چالیس ہزار روپے میں کام چل جائے گا!"

"کتنا روپیہ؟" ابا نے حیرت سے پوچھا۔

"تیس ہزار تو میرے پاس موجود ہے، باقی اگر اور ضرورت ہوئی تو میں اپنے آدمی کو بھیج کر منگوا دوں گا۔"

"ارے بیٹے اتنی رقم کی کیا ضرورت ہے، اتنی رقم تو چوہدری صاحب نے بھی نہیں خرچ کی تھی، مگر تیس ہزار، ارے نہیں۔ بس اتنی مناسب ہے، جتنی شریف آدمی بہنوں کی شادی پر کرتے ہیں۔"

"میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر روپے نکالے اور ابا کے قدموں میں ڈال دیئے۔

"یہ پینتیس ہزار روپے ہیں ابا، آپ انہیں، خرچ کریں، میں کچھ اور رقم کراچی جا کر بھجوا دوں گا۔ کوئی حسرت نہ رہ جائے میری بہنوں کے دل میں، انہیں اتنا دیں کہ وہ نہال

ہو جائیں۔"

"رقم گنتے ہوئے میرے معصوم باپ کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں' اور پھر وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے!

"بیٹے۔ خدا نے ہماری سن لی ہے' میں اس کا جتنا شکر کروں کم ہے۔ اس نے ہمیں وہ دے دیا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' اتنی بڑی رقم' لیکن بیٹے ایک سوال میں تم سے ضرور کروں گا!"

"جی ابا جی!"

"یہ رقم جائز تو ہے نا' مجھے معاف کر دینا۔"

"آپ کو اپنی تربیت پر اعتماد نہیں ہے ابا جی!

"خون پر اعتماد ہے۔" ابا جی نے جواب دیا۔

"ابتداء میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا' کچھ غلط لوگوں کے ہاتھوں میں پھنس گیا' لیکن میں نے ناجائز کام نہیں کیا ابا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ ایک عمدہ کام مل گیا ہے' میں نے یہ رقم نہ تو کسی کی حق تلفی کر کے حاصل کی ہے' اور نہ کسی ناجائز ذریعہ سے۔ اور میرے کرم فرماؤں نے تو کہا ہے کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو منگوالی جائے!"

"ارے نہیں بیٹے.... یہ رقم تو اتنی رقم ہے کہ.... گاؤں میں بہت کم لڑکیوں کی شادی پر خرچ ہوئی ہو گی' لیکن بیٹے' یہ رقم میں اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔"

"اوہ' پھر ابا؟"

"چوہدری صاحب کے پاس رکھ دوں گا!" وہ ہمارے بڑے کرم فرما ہیں!"

"ٹھیک ہے ابا۔ ان کے مشوروں سے سارے کام کریں!"

"ابا کی بری حالت تھی' خوشی کی وجہ سے کئی بار ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ معمولی بات نہیں تھی' ان کے بیٹے نے وہ کر دکھایا تھا جو عموماً لوگ نہیں کر پاتے' بہرحال وہ بے حد خوش تھے۔

"دوسرے دن علی الصبح ہم دونوں باپ بیٹے چوہدری صاحب کے پاس چل پڑے' چوہدری صاحب کو بھی ہمارے آنے کی اطلاع مل گئی تھی' انہوں نے بڑا پرتپاک استقبال کیا اور بے حد خوش ہوئے۔

"ارے تمہارا بیٹا تو بابو بن گیا' میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ کیسے ہو سردار بیٹے۔"!

"آپ کی نوازش ہے چوہدری صاحب' آپ کے طفیل میں ہم بھی انسان بن گئے۔"

"میاں صاحب خدا کا کرم ہے' میں کیا اور میری بساط کیا' لیکن انسان بھی تو لائق ہو'

تم نے جس طرح اپنے باپ کی پگڑی سنبھالی ہے۔ وہ ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ خدا تمہیں لائق رکھے۔"

"یہ چوہدری صاحب ایک امانت ہے میری بیٹیوں کی سردار نے ان کی شادی کے لئے دی ہے' آپ سے بڑا امین اور کون ہے بستی میں۔" ابا جی نے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر چوہدری صاحب کے سامنے رکھ دیں۔

"ارے' یہ' یہ سردار لایا ہے!"

"ہاں چوہدری صاحب بہنوں کی شادی کی ذمہ داریاں میں آپ کے شانوں پر ڈالنا چاہتا ہوں' مجھے یقین ہے چوہدری صاحب کہ آپ جو کریں گے میری بہنوں کے حق میں اچھا کریں گے۔"

"سبحان اللہ' روح خوش ہو گئی' یہ تو بہت بڑی رقم ہے' کتنی ہے بیٹے۔؟"

"پینتیس ہزار ہیں چوہدری صاحب' دراصل میں ملک سے باہر جا رہا ہوں' اس لئے اب یہ ذمہ داری آپ کو سنبھالنا ہو گی!"

"گاؤں کی بیٹیاں اپنی ہی ہوتی ہیں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے' بے فکر' رہو' ہاں بہتر ہو گا کہ لڑکے کا انتخاب خود کر لو۔"

"حمید اللہ صاحب کے ہاں سے رشتے آئے ہیں دونوں لڑکیوں کے لئے۔

"واہ! نہایت نیک بچے ہیں دونوں۔" چوہدری صاحب نے کہا اور کافی دیر تک ان سے گفتگو رہی' انہوں نے ہماری خوب خاطر مدارت کی تھی۔

"بہرحال گیارھویں دن میں سب سے رخصت ہو کر واپس کراچی چل پڑا' لا تعداد دعاؤں کے ساتھ بے شمار لوگوں نے مجھے رخصت کیا تھا' میں نے ابا جی سے وعدہ کر لیا تھا کہ انہیں خیریت بھیجتا رہوں گا!

"اور اس کے بعد.... وہی ہنگاموں کا شہر کراچی وہی حسین اور پر اسرار مکان' جہاں فوزیہ.... اور گریس تھیں' اور اس کے بعد۔ مجھے اہم مشن پر روانہ ہونا تھا' مشن جواب بالکل نزدیک آ گیا تھا' بس مجھے آخری تربیت دینی باقی تھی۔"

"قدرت کے کھیل انوکھے ہوتے ہیں۔ میں جس وقت بستی سے چلا تھا تو کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن اس انداز میں یہاں واپس آؤں گا۔ کراچی نے جس طرح میرا استقبال کیا تھا وہ بھی بہت مایوس کن بات تھی' لیکن پھر حالات نے مجھے سنبھال لیا۔ اور کوئی راہ نہ رہی تو ایک ایسی سبیل پیدا ہو گئی کہ مجھ جیسا ناکارہ آدمی بھی کسی کے لئے کار آمد بن گیا اور ایسا کار آمد کہ وہ لوگ ہمارے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئے' اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میں جو خود اپنی ہی ذات پر بوجھ تھا' میں جو اپنوں

کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک اور خاندان کا سہارا بھی بن گیا تھا' غیاث' اسی جیسے مخلص اور بے لوث لوگ کہاں ہوتے ہیں' انہوں نے جس طرح مجھے سہارا دیا تھا۔ میں اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان تھا کہ میں نے انہیں بھی زندگی کے ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا کہ اگر غیاث پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرتا تو یقینی طور پر وہ ایک بہت بڑا آدمی بن سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں ہو چکی تھیں اور اب میں بہت سے مراحل کی تکمیل سے گزر چکا تھا اور اب مجھے ان لوگوں کی ادائیگی کرنا تھی۔

کراچی ایئرپورٹ پر فوزیہ اور دو نئے چہروں نے میرا استقبال کیا۔ اعظم بھی میرے ساتھ تھا۔ فوزیہ نے مجھے دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا پھر جب میں باہر نکلا تو وہ بے اختیار میرے پاس پہنچ گئی۔

"اوہ ہارون۔ ہارون آپ واپس آگئے۔" اس نے فرط مسرت سے میرا ایک ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے چہرے پرخلوص کی سچائی نظر آئی تھی' میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا۔

"ہاں فوزیہ نا آنے کیا سوال تھا۔"

"آپ یقین کریں ہارون' بس میں کیا کہوں۔"

"کیوں۔ کہونا۔" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ہارون کچھ نہیں کہوں گی' یوں سمجھو بس میں شدت سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ اور فوزیہ سحرطراز نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔

باہر مجھے کار لے جانے کے لئے موجود تھی۔ میں اس کار میں بیٹھ کر ایک بار پھر اس عمارت میں پہنچ گیا۔ جہاں میں نے ایک حسین زندگی کی ابتداء کی تھی اور یہ ابتداء میرے تصور سے بھی بالا تھی۔ افضال صاحب نے بھی مجھ سے ملاقات کی اور میری خیریت پوچھنے لگے۔

"بالکل ٹھیک ہوں جناب اور آپ لوگوں کا انتہائی احسان مند"

"نہیں یہاں احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں جو کچھ ہوا وہ کچھ دے اور کچھ لے کی بنیاد پر ہوا ہے۔"

"لیکن افضال صاحب میں اسے کاروبار نہیں سمجھتا۔ میں آپ کو کیا دے رہا ہوں آپ لوگوں نے مجھے زندگی کی تمام نعمتوں سے مالامال کر دیا ہے۔"

"نہیں نہیں ہارون یہاں تمہاری شرافت ہے اب تمہیں جو کچھ ہمارے لئے کرنا ہے

وہ ہماری اس محنت کا پورا پورا صلہ ہوگا۔"

"میں آپ کے لئے خلوص دل سے سب کچھ کرنے کے تیار ہوں افضال صاحب۔" میں نے جواب دیا اور افضال صاحب نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا' پھر فوزیہ کو دیکھنے لگے' ان معنی خیز نگاہوں کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا' لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

"اسی شام فوزیہ نے ڈنر کی میز پر مجھ سے پوچھا۔ "اب کیا ارادے ہیں ہارون؟"

"جو آپ کہیں فوزیہ۔"

"نہیں میں نہیں کہوں گی۔ دیکھو ہمارے ذہن میں ہمیشہ ایک تصور رہا ہے' وہ یہ کہ ہم تمہیں پہلے مکمل طور پر مطمئن کریں تمہارے ذہن سے ہر الجھن مٹا دیں اور اس کے بعد تم ہمارے لئے کام کرو۔"

"فوزیہ آپ لوگوں کی عنایت سے میری ساری الجھنیں مٹ چکی ہیں۔ میری بہنوں کے رشتے آئے ہوئے تھے میں نے ان کی تکمیل کر دی۔ میرے باپ کے سر سے بیٹیوں کا بوجھ اتر گیا۔ اور اب ہم دونوں باپ بیٹے آزاد ہیں۔ میرے والد نہایت اطمینان سے بستی میں گزارا کر سکتے ہیں اور میں آپ لوگوں کا خادم ہوں۔"

"خادم نہیں۔ دوست۔" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہانا یہ تو آپ لوگوں کی عنایت ہے' ورنہ میں تو آپ کا خادم ہوں۔"

"میرے بھی۔" فوزیہ نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں فوزیہ آپ ان لوگوں سے الگ تو نہیں ہیں۔"

"اچھا جی الگ نہیں ہوں۔ اب یہ بے رخی کی باتیں۔" وہ ناز بھرے انداز میں بولی اور میں اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں نہیں میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"جی کیا مطلب ہے آپ کا۔" فوزیہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"میں' میں کیا بتاؤں فوزیہ۔ آپ سب۔ دراصل آپ سب میرے کرم فرما ہیں۔"

"اچھا اچھا اب یہ نیاز مندی کی باتیں چھوڑ دیجئے ہارون صاحب آپ کو پتہ ہے آپ کتنے بڑے انسان ہیں' آپ کو تو اپنے لہجے میں تحکم اور ایک ایسا انداز پیدا کرنا ہے جیسے آپ دنیا کے ہر شخص کو خود سے حقیر سمجھتے ہوں آپ کا اپنا مقابل کوئی نہ ہو۔" فوزیہ نے کہا۔

"نہیں فوزیہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" میں ساری جان سے لرز گیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں خود کو مصنوعی طور پر بھی اس انداز میں نہیں ڈھال سکتا۔" میں نے صاف لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں ہارون' میرا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا سے یہ کہو گے تھوڑی کہ تم بہت بڑے آدمی ہو' کوئی بہت بڑی چیز ہو۔ میرا مقصد ہے کہ ایک ایسے آدمی کی طرح تم میں وقار اور تمکنت ہونا چاہئے' جو بہت ہی اعلیٰ حیثیت کا حامل ہو' یہ تو تمہاری ضرورت ہے۔ اس میں کسی قسم کے غرور یا بڑائی کا تصور نہیں ہے۔ تمہیں جس شخص کا کردار ادا کرنا ہے وہ ایسا ہی تھا۔"

"جی۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ گریس نے تمہیں جو کچھ سکھایا تھا وہ تمہارے ذہن نشین ہے؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر کل سے فائنل ریہرسل شروع ہو جائے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" فوزیہ نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔" اور دوسرے دن سے واقعی ریہرسل شروع ہوگئی۔ مجھے کار ڈرائیونگ سکھا دی گئی تھی۔ عمدہ لباس پہننا میں نے سیکھ لیا تھا۔ اب میں نفیس ترین سوٹ باآسانی پہن لیتا تھا۔ ہر چیز مجھے آگئی تھی۔ گو یہ سب کچھ میرا اپنا نہیں تھا۔ میں نے اپنی شخصیت پر خول چڑھا رکھا تھا لیکن یہ میری تمام پریشانیوں کا معاوضہ تھا۔ چنانچہ مجھے کوئی تردد بھی نہیں تھا۔ پرانی باتوں کو میں بھول گیا تھا۔ جیسے رمضان اور دوسرے تمام کردار وقتی طور پر چہرے ذہن سے نکل گئے تھے اب میں انہیں یاد نہیں کرتا تھا۔ وہ تو خواب کی باتیں تھیں۔ ممکن ہے یہ بھی خواب کی باتیں ہوں۔ کبھی نہ کبھی ان لوگوں کا کام بھی ہو جائے گا اور ممکن ہے اس کے بعد میں بھی ان سے علیحدہ ہو جاؤں۔ چنانچہ زندگی کو خواب سمجھنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اور کبھی کسی خواب کو ذہن پر اس قدر مسلط نہ کر لیا جائے کہ جاگنے کے بعد زندگی بے کار نظر آنے لگے۔ چنانچہ اپنی حیثیت کبھی بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ البتہ ان لوگوں کو معاوضہ مجھے ادا کرنا تھا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ ضروری تھا جو وہ مجھے ادا کرنا تھا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ ضروری تھا جو وہ مجھے کہتے تھے۔



"تقریباً دس دن مزید یہاں صرف کیے گئے اور اس کے بعد فوزیہ نے مجھ سے بات کی۔

"کل ہم لاہور چل رہے ہیں ہارون۔" اس نے بھاری لہجے میں کہا۔ اور میں چونک پڑا۔

"لاہور؟"

"ہاں' دادا جان کے پاس۔"

"اوہ۔ اچھا۔ گویا یہاں کی تیاریاں مکمل ہوگئیں؟"

"ہاں۔ تم بھی اپنے "آپ کو مکمل پاتے ہونا ہارون۔؟" فوزیہ نے مجھے باقاعدہ ہارون کہنا شروع کر دیا تھا۔

"بالکل مکمل۔ لیکن اب یہ تو بتاؤ کیا دادا جان کو میرے آنے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔؟" میں نے سوال کیا۔

"عمدہ سوال ہے ہارون' تم سے مجھے اس ذہانت کی توقع تھی۔ ہاں انہیں یہ اطلاع پہنچادی گئی ہے۔"

"ٹھیک۔ تو میرا خیال ہے تم مجھے کچھ اور تفصیلات جو دادا جان سے متعلق ہوں بتا دو۔" میں نے کہا۔

"ضرور۔" فوزیہ بولی' پھر کہنے لگی۔ "سنو ہارون میں تمہاری دادا جان کے بارے میں تو بتا ہی چکی ہوں کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ لاہور میں وہ جس مکان میں رہتے ہیں وہاں ہمارے کچھ دوسرے عزیز بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں ان میں تصدق صاحب ہیں جو صرف وہاں ماموں کہلاتے ہیں۔ ان کے اہل خانہ ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے افراد ہیں جن کا میں تعارف کرادوں گی لیکن تصدق صاحب تمہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم بھی ان سے اجنبیت کا اظہار نہیں کرو گے۔ ہاں ہارون اب میں تمہیں یہ بتادوں کہ تم لندن سے کراچی آتے ہوئے ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ ہوائی جہاز تباہ ہو گیا تھا اور اس کے مسافر کی لاشیں بھی نہ مل سکی تھیں۔ ظاہر ہے تم اس حادثے میں بچ نہ گئے ہوتے تو یہاں تک کیسے پہنچتے۔ چنانچہ بچ کر گھومتے پھرے اور اس کے بعد بالآخر یہاں آ گئے۔ میرا مقصد ہے تم اس کہانی کو سمجھ چکے ہوگے۔ اب میں تمہیں بقیہ تفصیل بتاتی ہوں۔"

"دادا جان کے ایک معالج ہیں نفیس صاحب۔ ڈاکٹر' نفیس اس خاندان کے قدیم معالج ہیں اور اس خاندان سے بڑی محبت اور انسیت رکھتے ہیں۔ دادا جان کے دوسرے گہرے دوست فرزند علی ایڈووکیٹ ہیں یہ بھی ہمارے اس خاندان سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ہاں ہارون تمہارے والد صاحب کا نام محمود علی تھا۔ وہ بیچارے بھی کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے اس کے بعد دادا جان نے تمہاری پرورش کی اور چودہ سال کی عمر میں تمہیں لندن بھیج دیا گیا۔ تم لندن سے کئی بار یہاں آ چکے تھے آخری بار جب تم لندن گئے ہوئے تھے تو تقریباً چھ سال پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم لندن سے واپس آ رہے تھے کہ یہ ہوائی حادثہ پیش آگیا۔" فوزیہ نے کہا اور میں تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"کیوں۔؟" اس نے مجھے اس طرح دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"لیکن مس فوزیہ پہلے تو آپ نے کچھ مختلف بات بتائی تھی۔ میرا مطلب ہے۔" اور فوزیہ کسی قدر چونک سی پڑی۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہنے

لگی۔

"ہارون۔ دراصل یہ دور بہت نازک ہے' ہر کام پورے غور وخوض کرنے کے بعد کیا جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ بعض لوگ ہماری نیتوں پر شک بھی کر سکتے ہیں چنانچہ ہم کسی شخص کو جانے بوجھے بغیر اس پر حقیقتیں آشکارا تو نہیں کر سکتے پہلے تمہیں کچھ اور بتایا گیا تھا۔ اس وقت ہمیں مکمل طور پر.....اعتماد ہے اور تم ایک فرض شناس انسان ہو اور ہمیں کسی طور تم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ چنانچہ اب اصلیت نہ بتانا حماقت تھی اور پھر ظاہر ہے تمہیں ہی ان مراحل سے گزرنا ہے اور اگر تم حقیقتوں سے واقف نہ ہوئے تو یہ سب کچھ کیسے کر سکو گے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگ اس قابل سمجھتے ہیں۔"

"تم کسی قابل ہو ہارون کوئی میرے دل سے پوچھے۔" فوزیہ نے جواب دیا۔ اور میں نے شرمسار ہو کر گردن جھکالی۔ بہرحال ذہنی طور پر میں نے خود کو تیار کر لیا تھا۔ فوزیہ دیر تک مجھ سے لاہور کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ اس نے مجھے مکمل تفصیلات بتا دی تھیں۔

اور پھر وقت مقررہ پر ہم لاہور چل پڑے۔ میرے ساتھ فوزیہ اور افضال صاحب تھے۔ باقی لوگ یہیں رہ گئے تھے۔ لاہور ایئرپورٹ پر پہنچے' رات ہوگئی تھی' لیکن ہمیں ریسیو کرنے کے لئے کچھ لوگ موجود تھے۔ وہ ہمیں ایک قیمتی کار میں بٹھا کر لے گئے اور اس سفر کا اختتام ایک خوبصورت بنگلے پر ہوا تھا۔

"بنگلے میں چند ملازم موجود تھے۔ انہوں نے ہمارا سامان وغیرہ اتارا اور فوزیہ مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔ خواب گاہ میں میرے لئے آرام کا بندوبست کیا گیا۔ ملازموں سے کافی لانے کے لئے کہہ دیا گیا تھا۔

"اور پھر کافی پیتے ہوئے افضال صاحب بولے۔ "واقعات کچھ اس طرح آپ کے سامنے آئیں گے ہارون یہاں کہ بعض جگہوں پر آپ کو حیرت ہوگی' لیکن ہمیں تمام مراحل سے گزرنا ہوگا۔ آپ ان سے پریشان نہ ہوں۔"

"کیا اس دوران آپ لوگ مجھ سے دور رہیں گے۔؟"

"اوہ۔ ہرگز نہیں! ہم آپ سے قریب رہیں گے۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں۔"

"جی۔ میں نہیں سمجھا؟"

"میں یہی سمجھا رہا ہوں۔ ہم لوگ آج ہی رات آپ کو یہاں چھوڑ کر مسعود لاج چلے جائیں گے اور وہاں قیام کریں گے۔ فوزیہ.... تمہارے چچا کی بیٹی ہے۔ یعنی افضال کی

بیٹی یعنی میری بیٹی۔" افضال صاحب نے کہا اور میں بری طرح اچھل پڑا۔

"ہاں تمہیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔ لیکن کیا کریں۔ ہمارے اوپر افتادہی ایسی پڑی ہے کہ ہماری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا جناب۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"جب میں تمہیں ہارون نہ سمجھوں گا اور تم بھی یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ تمہاری کوئی اور شخصیت تھی۔ تو ہارون میاں مقصد یہ ہے کہ میں تمہارا سو فیصد چچا ہوں۔" مسعود صاحب نے اپنی بیگم یعنی تمہارے والد محمود صاحب کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرلی تھی۔ یہ شادی انہوں نے ایک ایسی خاتون سے کی تھی جو بیوہ تھیں اور ان کے پہلے شوہر کا لڑکا بھی تھا یعنی میں اس طرح میں مسعود صاحب کی بیوی کا بیٹا ہوں ان کا نہیں۔ لیکن میں نے مسعود علی صاحب کا نمک کھایا انہیں کے گھر پروان چڑھا اس لئے انہیں سگے باپ کی مانند سمجھتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ خاندان کے دوسرے لوگوں نے مجھے کبھی قبول نہیں کیا۔ مجھے جوان ہونے کے بعد اپنا ایک ٹھکانا بنانا پڑا اور میں زیادہ تر ان لوگوں سے الگ تھلگ رہا۔ لیکن میں اس خاندان کا نمک خوار تھا۔ میں نے ہمیشہ ان کے مفادات کا خیال رکھا اور اس پر جان دیتا رہا' پھر بدقسمتی سے تمہارے والدین کا انتقال ہوگیا۔ دونوں ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے اس کے بعد تمہارے دادا یعنی مسعود علی صاحب نے تمہاری پرورش کی۔ اور اس کے بعد کی کہانی فوزیہ تمہیں سنا چکی ہے۔" افضال صاحب خاموش ہوگئے۔

"میرا دماغ ہل کر رہ گیا تھا۔ ہر لمحہ ایک نئی کہانی سننے کو مل رہی تھی۔ ہر بار کچھ نئے انکشافات ہو رہے تھے۔ فوزیہ افضال صاحب کی بیٹی ہے' لیکن یہ کیسے باپ بیٹی ہیں۔ ایک دوسرے سے اس قدر بے تکلف کہ رشتے کا فرق ہی مٹ جائے۔ فوزیہ افضال صاحب کے سامنے سخت بے حجاب تھی اور دونوں ہر طرح کی گفتگو کر لیتے تھے۔ آخر کیوں۔ آخر کیوں۔ لیکن میرا ذہن ان نفیس ترین لوگوں کے بارے میں کسی برے انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ میں ان کے لئے بہت اچھے جذبات رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے کوئی بری بات نہیں سوچی سوائے اس کے کہ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور پھر کراچی کے ماحول کے پروردہ بھی تو تھے۔

"بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی ہارون۔ فوزیہ نے کہا۔

"ہاں کافی حد تک۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ دادا جان بالکل ہی زندہ درگور ہو جائیں۔ ہارون کی موت کے صدمے نے ان کا دماغ الٹ دیا ہے اور ہماری خواہش ہے کہ تمہیں ہارون سمجھ کر وہ ٹھیک ہو جائیں۔ بس تمہیں اب بہترین اداکاری کرنی ہے۔"

"آپ لوگ مطمئن رہیں۔ اس نے میرے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے عوض میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو مطمئن کروں۔"

"تم بھی ساری زندگی کسی تکلیف کا شکار نہ ہو سکو گے ہارون۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے کام آؤں گا!"

"مجھے یقین ہے جناب۔" میں نے جواب دیا۔ ہم لوگ کافی سے شغل کر رہے تھے۔اور دونوں باپ بیٹی مجھے پڑھاتے رہے تھے' یہاں تک کہ وہ مطمئن ہو گئے۔ اور پھر افضال صاحب نے کہا۔

"فوزیہ۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں کہ گاڑی تیار ہے یا نہیں تم ہارون سے اجازت لے لو۔"

"اوکے ڈیڈی۔" فوزیہ نے جواب دیا اور افضال صاحب باہر نکل گئے۔ تب فوزیہ اٹھ کر میرے نزدیک پہنچ گئی۔

"تمہارے ذہن میں کوئی پریشان کن احساس تو نہیں ہے ہارون؟" وہ میری کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔ اس سے زیادہ وہ میرے قریب کبھی نہیں آئی تھی۔

"ہرگز نہیں' تم لوگوں کی موجودگی میں میرے ذہن میں کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"اتنا ہی اعتماد کرتے ہو مجھ پر۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے کہا اور فوزیہ میرے اوپر جھک گئی۔ اس قدر کہ اس کا بدن میرے بدن سے مس ہونے لگا۔ میرا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

"تو یقین کرو ہارون۔ تمہارے اس اعتماد کو کبھی شکست نہیں ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتی ہارون کہ اگر اصل ہارون تمہاری جگہ ہوتا تو میں اسے اس قدر چاہ سکتی تھی یا نہیں لیکن تمہاری بات علیحدہ ہے۔ تم پر تو میں اپنی جان نچھاور کر سکتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں مس فوزیہ۔" میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں جاؤں ہارون۔" فوزیہ نے اپنا چہرہ بالکل میرے سامنے کر دیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں' لیکن ابھی میں بمشکل چند ہی کتابیں پڑھ سکا تھا۔ ان کی زبان ہی مشکل سے میری سمجھ میں آتی تھیں آنکھوں کی زبان کیا سمجھتا۔

"آپ کو جانا تو ہے نا فوزیہ؟"

"ہاں۔ لیکن تمہارے پاس جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"لیکن جیسا کہ آپ نے فیصلہ کیا ہے۔ مجھے بھی تو یہاں پہنچنا ہے۔" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی اور پھر ہتھے سے اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تشنگی تھی اور د،

خشک ہونٹوں پر زبان پر پھیر رہی تھی۔ پھر وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک میں پریشان سا بیٹھا رہا۔ میں ان تمام واقعات پر غور کر رہا تھا۔ بڑے پراسرار حالات تھے۔ اب میں دیہات کا وہ خبطی نوجوان نہیں تھا جس کی اپنی کوئی سوچ نہیں تھی.... میں بہت سی باتوں پر سوچ سکتا تھا۔ رمضان کو میں نے کیا سمجھا تھا لیکن وہ کیا نکلا۔ کراچی کے حالات نے مجھے ہوشیار رہنا سکھایا تھا۔ لیکن یہ لوگ' فوزیہ اور افضال صاحب برے لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے میرے اوپر کتنے احسانات کئے تھے۔ میں ان احسانات کا بدلہ ضرور دوں گا۔ اور یہ بدلہ ہوگا کہ ان کے پروگرام پر حروف بہ حروف عمل کروں۔

اس فیصلہ کے بعد میں آرام کرنے لیٹ گیا اور بستر پر بھی یہی خیالات میرے ذہن میں چکراتے رہے۔ اور پھر میں سو گیا۔

دوسری صبح مجھے ایک ملازمہ نے جگایا۔ شوخ وسنگ سی لڑکی تھی۔ میلے کچیلے لباس میں مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اس کی مسکراہٹ پر کسی قدر بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"دس بجے ہیں صاحب جی۔"

"کیا۔" !" میں اچھل پڑا' اور وہ منہ دبا کر ہنس پڑی۔ میں اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ دس بج گئے ہیں تو کیا ہوا مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک ہو گیا۔" دس بج گئے تو میں کیا کروں؟"

"ناشتہ نہیں کرو گے صاحب جی؟"

"تو نے مجھے ناشتہ کرنے کے لئے جگایا ہے!؟"

"ہاں جی۔ میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو دس بجے تک ناشتہ نہ کرتا ہو۔ میں تو اگر سات بجے ناشتہ نہ کروں تو درد کے مارے میرا پیٹ پھٹنے لگتا ہے' لیکن بعض اوقات تو مجھے غصہ آتا ہے صاحب جی کہ رات اتنی لمبی کیوں ہوتی ہے۔"

"اوہ۔ اچھا اب تو بھاگ جا۔ کیا نام ہے تیرا؟"

"جانو۔" اس نے جواب دیا اور پھر بولی۔" تو ہم ناشتہ لگا دیں۔ نہاؤ گے صاحب جی؟"

"ہاں۔ تو ناشتہ لگا میں نہانے جا رہا ہوں۔ پھر آ کر "مجھے بلا لے جانا۔" میں نے کہا اور وہ گردن ہلا کر واپس چلی گئی میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا اور وہ دروازہ سے باہر نکل گئی تو میں نے گہری سانس لی پھر میں ملحقہ باتھ روم میں جا گھسا۔

"اب سے چند ماہ قبل یہ چیزیں میرے لئے اجنبی تھیں۔ لیکن اب میں ان تمام چیزوں کے استعمال سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ پھر جب باتھ روم سے باہر نکلا تو جانو ایک کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی لیکن اس نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا۔ اسے میرے باہر نکلنے کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑی۔

"ارے باپ رے۔ اس نے جلدی سے اخبار رکھ دیا۔

"پڑھی لکھی ہو تم جانو؟" میں نے پوچھا۔

"نن نہیں صاحب جی۔ اسکول سے ڈر لگتا ہے۔"

"پڑھ تھوڑی رہے تھے صاحب جی۔ میں تصویریں دیکھ رہی تھی۔ مگر آج کے اخبار میں کوئی تصویر ہی نہیں ہے۔"

"تصویریں بھی تم الٹی ہی دیکھتی ہو؟"

"الٹی۔؟ کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"تم نے اخبار الٹا پکڑ رکھا تھا۔"

"پکڑ رکھا ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ الٹا تھا یا سیدھا۔ تصویر ہوتی تو پتہ چلتا۔ جب تصویر ہی نہ ہو تو کیسے پتہ چلے کہ اخبار الٹا ہے یا سیدھا۔" اس نے کہا اور مجھے اس کے جواب پر بہت ہنسی آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ناشتہ کر رہا تھا۔ جانو کی معصوم باتوں نے میرے ذہن سے تنہائی کا احساس ختم کر دیا تھا۔ بڑی باتونی لڑکی ہے۔ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سناتی رہی اور میں ہنستا رہا۔ اس شام اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی یہ رات گزار کر دوسرے دن مجھے اپنے عمل کا آغاز کرنا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن میں جلدی جاگ گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو جانو باہر کی صفائی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑی اور پھر ہنسنے لگی۔

"کیوں۔ ہنس کیوں رہی ہو جانو؟"

"رات کو تم نے بہت تھوڑا کھانا کھایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ آج جلدی اٹھو گے اس لئے میں نے ناشتہ تیار کر لیا دیکھ لو میں کتنی چالاک ہوں۔" اس نے کہا اور میں مسکرانے لگا۔

"واقعی تو بڑی چالاک ہے جانو۔ کیا کہنے تیری چالاکی کے۔ تو اب کتنی دیر میں ناشتہ کرائے گی۔؟"

"بھوک لگ رہی ہے نا۔ بس ابھی۔" اس نے کہا اور کام چھوڑ کر ایک طرف بھاگ گئی۔ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

"دن کو گیارہ بجے میں جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا یہاں دوسرے کچھ ملازم تھے۔ جنہیں ہدایت کردی گئی تھی کہ میرے احکامات کی تعمیل کریں۔ چنانچہ میں نے ایک ملازم سے ٹیکسی منگوائی اور افضال صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر چل پڑا۔ ٹیکسی جس جگہ رکی وہ ایک خوبصورت حویلی نما مکان تھا۔

"بہت بڑا دروازہ تھا جس کے بعد گھاس کا لان دور تک چلا گیا تھا اور اس کے بعد اصل عمارت تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ ٹیکسی اندر لے چلے۔ چنانچہ صدر دروازے کے پاس ٹیکسی رک گئی اور میں نیچے اتر آیا۔



"میرے بدن پر ایک خوبصورت لباس تھا اور جیب میں خاصی کرنسی موجود تھی میں نے ڈرائیور کو بل ادا کیا اسی وقت ایک شخص صدر دروازے سے باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر رک گیا۔

لیکن دوسرے لمحے اس کے اوپر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے' اس کے منہ سے صرف ایک ہی جملہ نکل رہا تھا۔

"ارے ' ارے ' ارے۔" اس کے منہ سے متحیرانہ انداز میں نکلا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اندر بھاگے یا باہر آئے ٹیکسی واپسی کے لئے مڑ چکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے۔ لیکن شکل و صورت سے وہ کوئی ملازم ہی معلوم ہوتا تھا' پھر وہ دوڑتا ہوا آیا اور بری طرح مجھ سے چمٹ گیا۔

"آپ سرکار آپ ہارون سرکار آپ' ارے میرے سرکار کیا یہ آپ ہی ہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا اور پھر بچوں کی طرح رو پڑا' اس کی بھوں بھوں کی آواز مجھے وہ بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی لیکن اس کی جذباتیت سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جو اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"سرکار۔ سرکار۔ مجھے نہیں پہچانتے۔ بتائیں سرکار۔ آپ زندہ ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اب سرکار سرکار ہی کرتے رہو گے یا اندر بھی چلو گے۔" میں نے کہا اور غفور انگوٹھے سے آنسو پونچھتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی غفور نے زور دار چھلانگ لگادی۔ وہ دوسروں کو اطلاع دینے گیا تھا۔ میں ابھی ہال ہی میں پہنچا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ دوڑ دوڑ کر آنا شروع ہو گئے۔ ان میں چند افراد معمر تھے۔ دو تین نوجوان تھے کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ تمام افراد میرے اردگرد جمع ہو گئے۔

"طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک معمر شخص مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔" آہ ہارون۔۔ ہارون میرے بچے۔۔ میرے لعل۔۔ کیا یہ سچ ہے۔۔ کیا یہ سچ ہے۔"

"ارے اندر تو چلو۔ خدا کی قسم آج کا دن بھی کیا ہے۔ ہارون' ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ بیٹھے کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں ہے۔"

"اندر چلو گے یا یہیں کھڑے باتیں کرتے رہو گے۔ آؤ ہارون بیٹے اندر آؤ۔ دوری معمر خاتون نے کہا۔ اور آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی۔ یوں مجھے گرفتار کر کے اندر لے جایا گیا۔ کوٹھی نہایت نفیس تھی۔ زمین پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔

"ارے کوئی نانا میاں کو تو اطلاع کرو۔" ایک نوجوان نے کہا اور دوسرے لمحے ایک معمر شخص نے اسے روک لیا۔

"ایسی حماقت بھی نہیں کرنا اختر۔ اگر انہیں اچانک یہ بات بتائی گئی تو کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی ذہنی کیفیت کے اعتدال کا خیال رکھنا ہے۔"

"جو حکم تصدق خالو۔" نوجوان نے کہا اور میں نے اس شخص کو ذہن میں رکھ لیا۔

یہ میرا ماموں تھا اور اس کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں کی چاؤں چاؤں رکی۔ اس کے لئے بھی تصدق ماموں نے ہی حکم دیا تھا۔"

"تم لوگوں نے اسے پریشان کر دیا ہے۔ کچھ آرام تو لینے دو۔ بلکہ میرا خیال ہے تھوڑی دیر کے لئے ہارون کو تنہا چھوڑ دو۔ چلو بچو۔ تم سب تو نکل ہی جاؤ۔ کیوں بیٹے تھکن محسوس کر رہے ہو؟" تصدق صاحب نے پوچھا۔

"نہیں ماموں جان۔ کوئی خاص نہیں۔ میں رات کو یہاں پہنچا تھا رات بھر آرام سے ایک ہوٹل میں قیام کیا ہے۔"

"رات ہی کو کیوں نہیں آ گئے تھے بیٹے۔ ہوٹل میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی بیٹے۔؟" تصدق ماموں نے کہا۔

"بس زیادہ رات ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کو کہاں تکلیف دوں۔ اس لئے ہوٹل میں رک گیا۔" کیا بتاؤں بیٹے دل کی حالت کیا ہے۔ دھڑکنیں کیا کہہ رہی ہیں۔ تمہارے آنے سے اس حویلی کی رونق واپس آ گئی ہے۔

"یہ اجڑ چکی تھی اس کے در و دیوار سوگوار تھے۔"

"میں جانتا تھا ماموں جان۔"

"مگر تم کہاں تھے بیٹے؟"

"مصر میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے ہمیں یہاں سے اپنی خیریت کا تار کیوں نہیں دیا؟"

"حالات ہی ایسے رہے ماموں جان' آپ کو جہاز کے حادثے کی اطلاع تو ملی ہو گی؟"

"ہاں! ملی تھی۔ اف کیا قیامت کا سماں تھا۔ ہم تو سکتے میں رہ گئے تھے۔ کیا کچھ نہیں کیا تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لئے۔ مگر ساری تدبیریں' ناکام رہیں۔" تصدق ماموں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"حادثہ ایسی جگہ ہوا تھا ماموں کہ کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"کیا تفصیل بتاؤ گے؟"

"تفصیل کیا بتاؤں ماموں' بس یوں سمجھیں کہ حادثہ ہوا اور کوئی کچھ نہیں کر سکا۔ چاروں طرف ایسی پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں جو ناقابل عبور تصور کی جاتی۔ ایک بار صرف آنکھ کھلی تھی اور اس کے بعد طویل بے ہوشی طاری ہو گئی۔ پھر دوبارہ جب ہوش آیا تو ہسپتال میں پڑا ہوا تھا اور جب زندگی کا احساس ہوا تو لوگوں سے اپنے بارے میں معلوم کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دماغی حالت درست رہی سر میں چوٹیں ضرور آئی تھیں لیکن ایسی نہیں کہ پاگل ہو جاتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میں مصر میں ہوں۔"

"اوہ۔ لیکن قاہرہ تک کیسے پہنچے۔؟"

"آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔" میں نے جواب دیا۔ یہ ساری باتیں مجھے افضال صاحب نے اچھی طرح پڑھا دی تھیں اور فوزیہ نے ان کی مشق بھی کرائی تھی۔ چنانچہ میں ان کے رٹائے ہوئے جملے بڑی فراخدلی سے استعمال کر رہا تھا۔

"تعجب کی بات ہے۔ بہرصورت جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ یہاں تو بیٹے ہم سب تمہارا ماتم کر چکے تھے اور بیٹے تمہارے دادا جان۔ میں نہیں کہہ سکتا بیٹے کہ مسعود صاحب کی کیا کیفیت ہوگئی تھی۔ آج بھی وہ گم صم ہیں۔ نہ کسی سے بات کرتے ہیں نہ چیت کرتے ہیں' بس کبھی کبھی ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں ان کی دماغی حالت درست نہیں رہی بیٹے۔ بڑے پریشان ہیں ہم لوگ۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اب بڑھاپے میں انہیں تکلیف دینے سے کیا فائدہ۔ خدا انہیں بہتر کرے گا تو بہتر ہوں گے۔"

"اوہ بیچارے دادا جان۔" میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں ہارون بیٹے۔ کیا کیا دل کہتا تھا ان کے لئے۔" ایک خاتون نے کہا۔ بدقسمتی سے میں ان کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں نے نہایت سعادت مندی سے گردن ہلادی۔

"اب تمہاری کیا کیفیت ہے بیٹے۔" ایک دوسرے صاحب نے پوچھا۔

"اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خدا کا احسان ہے خدا کا شکر ہے' اس نے ہم سب کو نئی زندگی دے دی ہے۔" وہی خاتون جو پہلے بھی مجھ سے مخاطب ہو چکی تھیں بولیں۔

"ہاں' اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔" کسی دوسری خاتون نے جواب دیا۔

"لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ مسعود صاحب کو اس بارے میں کیسے بتایا جائے۔" تصدق صاحب نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے۔"

"کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ ہم انہیں اس خوشخبری سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" تصدق صاحب پھر بولے۔

"میرا خیال ہے اس بارے میں ڈاکٹر نفیس سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" ایک خاتون نے مشورہ دیا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" تصدق صاحب نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔" تو پھر ایسا کیا جائے پہلے ڈاکٹر نفیس کو ٹیلی فون کردیں۔ ڈاکٹر نفیس آ جائیں اور اس بارے میں وہ جو مشورہ دیں اسی پر عمل کیا جائے۔" یہی بات طے ہوگئی اور تصدق صاحب نے ایک صاحب کو ٹیلی فون کرنے کو کہہ دیا۔ اور وہ صاحب کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گئے تھے۔

"بڑا برا حشر تھا' ان لوگوں کی باتیں سن سن کر کان پک گئے تھے ہر شخص ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب سے زیادہ مجھے چاہتا ہے۔ ہر شخص دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ میں ان لوگوں کے درمیان گھر گیا تھا۔ یہ میرے اپنے نہیں تھے لیکن کس طرح اپنائیت کا اظہار کر رہے تھے۔

بہر صورت ڈاکٹر صاحب کا انتظار ہوتا رہا۔ میرے لئے چائے منگوائی گئی تھی۔ ہر شخص انفرادی طور پر میری خاطرمدارت کرنا چاہتا تھا۔ تب ایک خاتون نے جو درمیانی عمر کی تھیں بولیں۔

"تمہارا کمرہ بیٹے اسی طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔ ایک بار کسی نے اس کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو بھائی میاں بگڑ گئے کہ خبردار کسی نے اس کمرے میں قدم رکھا اور پھر ان پر دورہ پڑ گیا تھا۔"

"اوہ!"

"تمہارے لباس وغیرہ بھی اسی طرح الماریوں میں ٹنگے ہوئے ہیں۔ ہم سب تمہارے لئے جذباتی تھے' لیکن کیا کرتے سب یادیں ہی تو رہ گئی تھیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب یادوں کے نشیب سے نکل آئے۔"

"ڈاکٹر نفیس صاحب ایک سنجیدہ انسان تھے۔ عمدہ شخصیت کے مالک' انہیں صورت حال نہیں معلوم تھی۔ لیکن جب میرے سامنے آئے تو سکتے میں رہ گئے۔ ان کی گہری نگاہیں لحہ بھر جمی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے دوسرے لوگوں کی شکلیں دیکھیں اور گہری سانس لے کر بولے۔

"شاید خدا کو مسعود صاحب کی نئی زندگی مقصود تھی۔ میری طرف سے زندگی کی مبارکباد قبول کرو ہارون میاں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" میں نے گردن خم کرکے کہا۔

"کیا مسعود صاحب کو تمہارے بارے میں اطلاع ہوگئی؟"

"ابھی تک نہیں دی ڈاکٹر صاحب۔ آپ سے مشورہ کئے بغیر دے بھی نہیں سکتے تھے۔ اب آپ بتائیں اس سلسلہ میں کیا کیا جائے؟" تصدق صاحب نے کہا۔

"آپ نے واقعی ذہانت کا کام کیا ہے۔ میں ان کے پاس جاتا ہوں' انہیں ایک انجکشن دوں گا اس کے بعد آپ انہیں مسعود صاحب کے سامنے لائیں۔" نفیس صاحب نے کہا۔ اور اٹھ گئے کسی کو میرے اوپر رتی برابر شبہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس بات نے

مجھے کافی مطمئن کیا تھا۔

"ہاں ایک کام اور کریں۔" نفیس صاحب رکتے ہوئے بولے

"جی۔" !

"فون پر افضال صاحب کو بھی اطلاع دیدیں' کچھ بھی ہے لیکن بہرحال وہ بھی اس گھر سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں۔" نفیس صاحب کی اس بات پر میں دل میں چونک پڑا اور میں نے دوسرے لوگوں کی صورتیں دیکھیں۔

چند چہرے بگڑ گئے تھے۔ لیکن تصدق صاحب جلدی سے بولے۔" لیکن افضال بھائی تو کراچی میں ہیں۔"

"جی نہیں آئے ہوئے ہیں کافی عرصہ سے۔"

"ارے ہم سے نہیں ملے۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم۔؟" تصدق صاحب نے پوچھا۔

"رات کو فوزیہ کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ مجھے ٹیلی فون کیا تھا انہوں نے۔ میں گیا تھا تب ملاقات ہوئی۔ نفیس صاحب نے جواب دیا اور باہر نکل گئے۔

"ان ڈاکٹر صاحب کا بھی دماغ چل گیا ہے انہیں اس گھر میں بلانے کی کیا تک ہے۔ وہ ہیں کون اس گھر کے۔" ایک خاتون نے کہا۔

جو اس سارے کھیل میں مقام اول رکھتی تھیں۔ میرے ذہن میں عجیب سے خیالات تھے اور میں کسی قدر سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ غلط بات ہے۔ رشتہ تو ہے ان کا جب مسعود صاحب اس رشتے کو تسلیم کرتے ہیں تو دوسرا نظرانداز کیوں کرے۔" تصدق صاحب نے جواب دیا اور خاتون ناک چڑھا کر رہ گئیں۔" میں ابھی انہیں فون کروں گا۔؟" تصدق صاحب نے کہا۔

میں اس گھر کے حالات سمجھ رہا تھا یہ گھر جن کیفیات کا شکار تھا اب وہ میری سمجھ میں آرہی تھیں لیکن اصلیت۔ اصلیت تو افضال صاحب ہی جانتے تھے۔ یہ سارا گورکھ دھندہ مجھے بے حد پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے زبان بند رکھنا تھی۔ مجھے خود وہی کرنا تھا جو میرے کرم فرماؤں نے مجھ سے کہا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے غرض نہیں تھی ان کے اپنے معاملات کچھ بھی ہوں۔

بالآخر ایک ملازم کمرے میں داخل ہوگیا۔ "ڈاکٹر صاحب نے کہا انہیں لے آیا جائے۔" اس نے کہا۔

"چلو ہارون میاں۔ خدا بہتر کرے۔" تصدق صاحب نے کہا اور میں اٹھ گیا۔ اور اب میں اس ہستی کے سامنے جا رہا تھا۔

مسعود صاحب سرخ و سفید رنگ کے ایک باریش بزرگ تھے۔ سفید لباس اور سفید

داڑھی میں بے حد پروقار نظر آ رہے تھے۔ اس وقت ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے نزدیک ہی ڈاکٹر نفیس کھڑے ہوئے تھے مسعود صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے' انہوں نے مجھے دروازے سے داخل ہوتے دیکھا اور ان کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

"میرے بچے۔ میرے لخت جگر۔" انہوں نے مجھے لپٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں میرے زندہ رہنے کی خبر سنا دی گئی تھی اور وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ نہ جانے کیوں چند لمحات کے لئے یہ احساس ہوا جیسے میں اپنوں میں ہوں اور مسعود صاحب سے سچ مچ میرا کوئی قلبی رشتہ ہے۔ مسعود صاحب روتے رہے۔ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی تھی۔

"مسعود صاحب یہ تو خوشی کا موقع ہے۔ خدا نے آپ کے گھر کو روشنی بخش دی۔ آپ تو مایوس نہیں ہوئے تھے۔ دیکھ لیجئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کی دعائیں قبول کیں۔"

"میرا بچہ۔ میرا ہارون۔" مسعود صاحب نے بڑی محبت سے مجھے بھینچ لیا۔ میں نے بھی ان کی محبت کا جواب اسی تپاک سے دیا تھا۔

"دیر تک یہ غمناک یا مسرت آمیز منظر جاری رہا اس کے بعد مسعود صاحب کو کچھ سکون ہوا۔" تمہارے تمام اعضاء تو سلامت ہیں۔؟"

"ہاں دادا جان خدا کا فضل ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بڑی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی؟" مسعود صاحب بولے۔

"جی ہاں۔ بے حد۔"

"آہ۔ خدا نے مجھے آخری وقت میں بہت بڑی خوشی دی ہے' زیب النساء میرا مصلیٰ بچھا دو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گا۔"

"جو حکم۔" ایک ملازمہ نے کہا اور دادا جان نماز پڑھنے چلے گئے۔ ڈاکٹر نفیس بے حد خوش تھے۔ آہستہ سے بولے۔

"بڑا مرحلہ طے ہو چکا اب کوئی فکر نہیں ہے۔"

"چچا جان کی ذہنی حالت بھی درست ہوگئی ہے۔ آپ نے دیکھا ڈاکٹر صاحب انہوں نے ساری باتیں ہوشمندوں کی سی کی ہیں۔"

"یہ کام بھی خودبخود ہوگیا۔ لیکن یہاں بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔" ڈاکٹر نفیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو تین دن تک بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔ خدا نے اتنی بڑی خوشی نصیب کی



ہے۔" ایک خاتون جنہیں میں اس دوران کئی بار دیکھ چکا تھا۔ بڑی چاہ سے کہا۔

"کب سے شروع کریں گی آپ؟" ڈاکٹر نفیس بولے۔

"بس آج ہی سے۔" خاتون فوراً بولیں۔

"سنجیدہ ہیں؟"

"کیونکہ ڈاکٹر صاحب۔ اس میں غیر سنجیدگی کی کیا بات ہے۔"

"بس پوچھ رہا تھا۔ انسان جس کام کا ارادہ کرے اس میں دیر نہ کرے۔ یقین فرمایئے صبح کو صرف ایک پیالی چائے پی تھی اور اب آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اس وقت اگر آپ مجھے کھانا کھلا دیں تو آپ کو دس بھوکوں کا ثواب ملے گا۔" ڈاکٹر نفیس پر مذاق انداز میں بولے اور سب ہنس پڑے۔

"میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔" خاتون نے کہا اور باہر نکل گئیں۔ دادا جان نماز پڑھ چکے تو سب کھانے کے لئے کمرے میں چلے گئے۔ اور پھر قہقہوں اور مسرتوں کے درمیان کھانا کھایا گیا۔

"اب تم لوگ ہارون کو میرے حوالے کر دو اور اب آرام کرو۔ شام کو پانچ بجے یہ تمہیں مل سکے گا۔" دادا میاں نے کہا۔ اور دوسرے لوگوں نے تعمیل کی' دادا میاں مجھے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئے تھے انہوں نے مجھے اپنے بستر پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے نزدیک بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے لپٹا لیا تھا۔" میرا بچہ' میری آنکھوں کا نور۔ خدا جانتا ہے مجھ پر کیا بیتی۔" "مجھے اندازہ ہے دادا میاں!" میں نے کہا۔

"بس بیٹے اب کبھی نہ جانا۔ میرا آخری وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہارے ہی ہاتھوں اپنی آخری آرام گاہ جاؤں۔"

"خدا آپ کو سلامت رکھے دادا جان۔ مجھے آپ کا سایہ درکار ہے۔"

"یہ بات صرف تم کہہ سکتے ہو بیٹے۔ کسی دوسرے کے دل میں یہ خواہش کہاں تھی۔"

"جی؟" میں نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"ہاں بیٹے۔ زمانے کے یہ رنگ اجنبی نہیں ہیں۔ تمہیں بھی تجربات ہونے چاہئیں۔ صدیوں سے دولت اور انسانیت میں تصادم چلا آ رہا ہے۔ یہ ظالم شے محبت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ میرے گرد میرے اپنے بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان کے سینوں میں میری محبت نہیں ہے۔ انہیں میرا سایہ درکار نہیں بلکہ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں جلدی سے اس جہاں سے رخصت ہو جاؤں تاکہ انہیں ان کا حق مل جائے۔"

"ایسے ہیں یہ لوگ؟" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

"ان کا قصور نہیں ہے بیٹے۔ ضرورتوں کی جونکیں انسان کے وجود سے شرافت کا سارا خون چوس لیتی ہیں اور جب خون ہی نہ ہو تو محبت کے ذرات کونسے سیال میں گردش کریں گے۔ یہ سب خواہشات کے اسیر ہیں۔ ان کی آرزوئیں ان سے سب کچھ چھین چکی ہیں۔ میں انہیں بے قصور قرار دیتا ہوں۔ تم بھی ساری زندگی ان کا خیال رکھنا۔ خدا نے ہمیں سب کچھ دیا ہے اگر اس میں سے کچھ ان کے کام بھی آ جائے تو ہمیں گھاٹا نہیں ہو گا۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ہارون؟"

"جی دادا جان۔" میں نے متاثر ہو کر کہا۔

"اپنے ساتھ بہت سی تقدیروں کو وابستہ رکھنا۔ بعض اوقات انسان اپنے بجائے دوسروں کی تقدیر سے کھاتا ہے۔ خدا کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں بہت بڑا تاجر ہے وہ۔ اس سے تجارت کرو گے تو کبھی گھاٹے میں نہ رہو گے۔ اور اس سے تجارت کا ذریعہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے دادا جان۔" میں نے خلوص دل سے کہا۔ بڑی خفت ہو رہی تھی مجھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنے نیک انسان کو میں دھوکہ دے رہا ہوں۔ جس کے خیالات اتنے بلند ہیں۔ لیکن خدا ہی گواہ تھا کہ یہ دھوکہ دہی کسی لالچ کے تحت نہیں تھی۔ افضال صاحب اور فوزیہ نے مجھے اس نیک کام پر آمادہ کیا تھا اگر وہ میرے ساتھ اتنا بہتر سلوک نہ کرتے اگر وہ مجھ پر وہ اخراجات نہ بھی کرتے جو کر چکے تھے تب بھی میں اس نیک انسان کا سہارا بننے میں عار نہ محسوس کرتا۔

"بہرحال شام پانچ بجے تک دادا جان مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ باربار میرے دل کو یہ خیال کچوکے دے رہا تھا کہ میں اس فرشتہ سیرت انسان کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ لیکن یہ اس کی زندگی کے لئے ہی ضروری تھا۔ اس خیال سے کسی قدر تسلی ہوتی تھی۔



"شام کو چائے کا اہتمام کوٹھی کے لان پر کیا گیا تھا۔ چائے کیا تھی ایک بہت بڑی پارٹی معلوم ہوتی تھی' زرق برق لباس حسین اور جگمگاتی ہوئی صورتیں۔ بہت سی نوجوان لڑکیاں تھیں' بوڑھی عورتیں تھیں بوڑھے مرد تھے' نوجوان تھے' نہ جانے کون کون تھا۔ سب کے سب مسکراتے ہوئے۔ سب نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔

"ارے ہارون میاں آپ نے لباس نہیں بدلا۔؟" ایک خاتون بولیں۔

"وہ ہمیشہ کا سادہ فطرت ہے۔"

"بڑائی کی یہی شان ہوتی ہے۔"

"ہارون میاں۔ آپ ان سب کو پہچانتے ہیں۔؟" تصدق ماموں نے پوچھا۔

"ماموں جان۔ یقین کیجئے آپ کے سوا کسی کو نہیں پہچان سکا حادثے نے میرے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ یقین کریں بعض اوقات اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں!"

"خدا تمہیں سلامت رکھے بیٹے' خدا تندرستی دے۔"

"آپ کو میری حالت معلوم ہو چکی ہے اس لئے اگر کسی کو میری بات ناگوار گزرے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں میرے لال مجال ہے کسی کی جو تمہاری بات کا برا مانے۔"

"اور تصدق ماموں چائے کے بعد آپ میرا ایک کام بھی کریں۔؟"

"ہاں' ہاں' کہو بیٹے۔" تصدق ماموں سراپا نیاز بن کر بولے۔

"ان سب سے میرا تعارف کرادیں آپ کا احسان ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے کوئی برا نہ مانے۔" دادا جان نے دخل دیا۔

"ارے لو۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ ہمیں اپنے بچے سے تعاون کرنا چاہئے' خدا نے ہمیں اس کی صورت دکھادی۔ یہ بات کیا کم ہے۔" وہی خاتون بولیں۔

"ٹھیک ہے یہ کام میں انجام دیتا ہوں۔" تصدق ماموں نے کہا اور پھر وہ کھڑے ہو کر بولے۔ "یہ پھوپی زلیخا ہیں' یہ پھوپی ناہید ہیں' یہ شازیہ ہے پھوپی زلیخا کی بیٹی' یہ طاہرہ ہے۔ یہ جمال ہے اور یہ۔"

"میں ذہن میں ان لوگوں کو محفوظ رکھتا جا رہا تھا' تعارف مکمل ہوگیا' میرے ذہن میں ایک اور سوال تھا لیکن میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا یہ سب لوگ اسی مکان میں رہتے ہیں یا ملنے آئے ہوئے ہیں؟ لیکن مجھے یقین تھا کہ اس بات کا وہ لوگ ضرور برا مان جائیں گے۔ بہرحال میں نے یہ سوال نہیں کیا اور تصدق ماموں اپنے کام سے فارغ ہو کر بیٹھ گئے۔

"دو دن گزر گئے۔ میرے اعزا میری زندگی کی بہت خوشیاں منائی تھیں۔ بلکہ تصدق ماموں نے تو اسی شام ایک تجویز بھی پیش کردی تھی۔ میں دادا جان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ تصدق ماموں بولے۔ "چچا جان میری ایک خواہش ہے!"

"کیا۔؟" دادا جان بولے۔

"کیوں نہ ہارون میاں کی واپسی کی خوشی میں ایک تقریب کر دی جائے۔۔"

"جیسا تم لوگ پسند کرو مجھے کیا اعتراض ہے۔"

"کیوں ہارون میاں؟"

"تقریب میں آپ کیا کریں گے ماموں جان؟"

"بھئی ہماری حیثیت کے لوگ شریک ہوں گے۔ طعام دیں گے انہیں بس خوشی کا اظہار ہو جائے گا اور کیا کریں گے۔" تصدق ماموں بولے۔

"ظاہر ہے میں آپ کے معاملات میں دخل اندازی کی جرات نہیں کر سکتا۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"بس میں ایسی باتوں سے الجھتا ہوں' لوگ آئیں گے مصنوعی پن کا اظہار کریں گے۔ مجھ سے سوالات کریں گے اور میں ایک ایک کو جواب دیتا پھروں گا۔"

"اوہ۔ تو اس میں حرج کیا ہے بیٹے۔ یہی زندگی کے کھیل ہوتے ہیں۔ بس یونہی انسان انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔" تصدق ماموں بولے۔

"حرج ہے بھئی۔" دادا جان نے دخل دیا۔

"جی۔؟" تصدق ماموں چونک پڑے۔

"اگر ہارون مناسب نہیں سمجھتا تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔" دادا جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور تصدق ماموں کا منہ لٹک گیا۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ لوگوں کی رائے۔ یہ تو صرف ایک تجویز تھی۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اٹھ گئے۔ اس وقت جب میں اندر کے ماحول سے اکتا کر لان پر نکل آیا اور لان کے ایک خوبصورت گوشے میں بیٹھ کر ان حالات پر غور کرنے لگا تو اچانک کسی طرف سے شازیہ نکل آئی اس نے ایک خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے بدن سے کسی عمدہ سینٹ کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"ہیلو ہارون۔"

"ہیلو۔" میں نے چونک کر کہا۔ اور شازیہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے کافی دیر تک کچھ نہیں کہا اور یونہی خاموش کھڑی رہی۔

"آپ' آپ۔" میں نے اس خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"یہ میں تم سے آپ کیوں ہوگئی۔"؟" وہ شکائتی انداز میں بولی۔

"اوہ۔ معاف کرنا شازیہ۔ تم میری ذہنی کیفیت سے واقف ہو۔"

"آپ بھی تو میری ذہنی کیفیت سے واقف تھے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"ایں۔ میں نہیں سمجھا۔؟"

"کیا نہیں مان سکتیں؟"

"تمہیں ساری دنیا یاد ہے سوائے میرے۔" اس کی آواز غمناک ہوگئی۔

"کیا تم میرے حالات سے واقف نہیں ہو شازیہ؟" میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"پھر مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں نے تو بچپن سے آج تک صرف ایک ہی خواب دیکھا ہے۔ میں تو زندہ درگور ہوگئی تھی ہارون جب۔ میرے منہ میں خاک۔ میرے منہ میں خاک۔"

"تم میری مدد نہیں کر سکتیں شازیہ؟" میں نے کہا۔

"کیسی مدد؟"

"کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں کہ میں زندہ بچ گیا۔ کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں پاگل نہ ہوگیا۔"

"خدا نہ کرے۔ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ہارون۔" وہ جلدی سے بولی۔

"میرے ساتھ جو حادثہ پیش آیا ہے وہ بے حد خوفناک تھا۔ کافی دن تک تو ڈاکٹر اس الجھن کا شکار رہے کہ میرا ذہنی توازن بھی درست ہوگا یا نہیں۔ کہیں میری یاداشت تو گم نہیں ہو جائے گی۔ لیکن میں مضبوط انسان نکلا۔ میں ٹھیک رہا لیکن بہت سی باتیں بھول گیا۔ اس میں میرا قصور نہیں۔"

"محبت تو بہت بڑی طاقت ہوتی ہے ہارون اور یہ یقین کرو کہ یہ صرف میری دعائیں تھیں جنہوں نے تمہیں زندگی بخشی۔ خدا نے تمہیں میرے لئے زندہ رکھا ہے۔"

"تمہارے لئے۔؟"

"ہاں تمہیں وہ خطوط بھی یاد نہیں جو میں تمہیں لکھا کرتی تھی۔"

"اوہ۔ خطوط۔ ہاں کچھ دھندلا سا خاکہ ہے میرے ذہن میں۔"

"اس محبت کو یاد کرو ہارون جو ہمارے درمیان تھی۔ تم ہمیشہ کہتے تھے کہ شازیہ یورپ بہت حسین ہے لیکن تمہارے بغیر اس کے من میں ایک نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ باتیں میں نے تمہیں خط میں لکھی تھیں؟"

"اکثر لکھا کرتے تھے۔"

"ان میں سے کوئی خط ہے تمہارے پاس؟" میں نے سوال کیا اور شازیہ گڑبڑا گئی لیکن چالاک لڑکی تھی فوراً بولی۔

"لو۔ ایسے خط بھی کہیں محفوظ رکھے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کے ہاتھ پڑ جائیں۔"

"کاش ان میں سے کوئی خط ہوتا۔"

"کیا کرتے ان کا؟"

"تمہیں پڑھ کر اپنے اور تمہارے درمیان روابط کا اندازہ کرتا۔"

"بدقسمتی سے نہیں۔" میں نے جواب دیا اور سسکنے لگی۔

"آہ میری تقدیر۔ اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔" وہ روتی ہوئی بولی اور میں دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اس کا خیال تھا کہ میں ان آنسوؤں پر تڑپ اٹھوں گا۔ دوڑ کر اسے سینے سے لگا لوں گا۔ تسلیاں دوں گا اور یوں ٹوٹے رشتے استوار ہو جائیں گے۔ لیکن ان میں سے کچھ نہیں ہوا۔ میں خاموشی سے اسے روتے دیکھتا رہا اور میری طرف سے کوئی پذیرائی نہ پاکر اس نے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا البتہ وہ بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں کچھ بھی یاد نہیں آتا ہارون؟"

"میں کیا کروں' میری یادداشت میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"صبر کرو۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"نہیں ہارون نہیں بچپن سے جو تاج محل بنایا ہے۔ وہ تمہارے چند الفاظ سے مسمار نہیں ہو سکتا' میں تمہیں چاہتی ہوں' کبھی تم بھی مجھے چاہتے تھے۔ لیکن آج تقدیر نے مجھ سے میری چاہت چھین لی ہے۔ میں صبر نہیں کر سکتی ہارون' میں صبر نہیں کر سکتی' تمہیں یاد کرنا ہوگا۔ تمہیں یاد آنا چاہئے۔ تمہیں سب کچھ یاد آنا چاہئے۔"

"اگر یاد نہ آیا تو میری سزا کیا ہوگی؟" میں نے سوال کیا وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"سزا۔ تمہیں سزا دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" وہ محبت بھرے انداز میں بولی۔

"تو پھر معاف کردو۔" میں نے مسخرے پن سے کہا۔

"کیا تم اپنے دل میں مجھے تلاش نہیں کرسکتے؟" وہ بولی۔

"کوشش کروں گا اور مل گئیں تو اطلاع دے دوں گا۔" میں نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شازیہ اپنی جگہ کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی۔

حالانکہ بڑے جذباتی مناظر تھے' وہ مجھ سے محبت کا اظہار کرتی رہی' خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن نجانے کیوں میرے دل میں اس کے لئے کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوا' کم از کم ہمدردی کا جذبہ بھی نہیں بس یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس محبت کے انداز اور ان آنسوؤں میں مصنوعیت ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جس کے پس پردہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ نہیں ہے جو وہ کہہ رہی تھی' حالانکہ میری موجودہ حیثیت کے مطابق وہ میری پھوپی زاد

بہن تھی۔

بہر صورت یہاں تو بہت سے معاملات تھے اور ان تمام معاملات سے مجھے نمٹنا تھا اور میں ان سے خائف بھی نہیں تھا۔ بہرحال یہاں کا ہر شخص میری پذیرائی میں لگا ہوا تھا جسے دیکھو میرے لئے نت نئی ترکیب سوچ رہا ہے' مجھے خوش رکھنے کی کوشش کر رہا ہے' لیکن ان تمام افراد کے اندر مجھے ایک مصنوعی پن کا احساس ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے ہوں۔ اپنی فطرتیں چھپا کر اپنے اندر کو مسخ کرکے وہ سب بیرونی طور پر میری محبت کے خول میں لپٹے ہوئے میرے سامنے آئے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ احساس جو میرے اندر تھا افضال صاحب کا پیدا کردہ ہو' مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا اس کے مطابق میری حیثیت سونے کی چڑیا جیسی تھی یہ چڑیا جس کے قبضے میں بھی آجائے۔

لیکن اس پورے مکان میں۔ میں جس شخص سے زیادہ متاثر تھا وہ دادا میاں تھے۔ دادا میاں واقعی ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے اس خاندان کو انہوں نے جس طرح جمع کر رکھا تھا اور جس طرح ان کی کفالت کر رہے تھے وہ قابل تحسین بات تھی ان کے انداز فکر میں بڑی وسعت تھی' حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے گرد جمع افراد ان کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے' وہ ان کی زندگی کے خواہاں نہیں ہیں' بلکہ ان کی دولت ان لوگوں کے لئے باعث کشش ہے اور اب یہ کشش میری ذات میں منتقل ہوگئی تھی۔

"افضال صاحب کے کردار کے بارے میں ابھی تک مجھے کچھ نہیں معلوم ہوسکا تھا ویسے یہاں ان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی' یہ درست تھا کہ وہ شخص ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا تھا' لیکن مجموعی طور پر میں نے اسے ان سب سے بہت زیادہ مخلص اور ہمدرد پایا تھا اور شاید وہ دادا جان کی دولت سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا' اگر ایسی بات ہوتی تو فوزیہ کے ساتھ وہ خود بھی یہاں مقیم ہوتا۔ کیونکہ دادا جان جس فطرت کے مالک تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خود بھی ان لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اسے انکار نہ کرتے۔

"افضال صاحب کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ ان دنوں ان سے ملاقات نہیں ہوئی یہاں تو میں ان کے آلہ کار کی حیثیت سے ہی کام کر رہا تھا' میری حیثیت سے صرف وہی واقف تھے اور باقی یہ تمام لوگ تو مجھے صرف مٹی کے مادھو معلوم ہوتے تھے۔ صرف خوشامد کرنے والے اور مجھے خوش رکھنے کے خواہاں۔

دو تین دن گزر چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ افضال صاحب سے بالکل ہی قطع تعلق مناسب نہیں ہے۔ کسی طور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کروں ان کی طرف سے مجھے

ہدایات ملتی رہنا چاہئیں' ظاہر ہے میں اپنے طور پر تو یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ مجھے مزید کیا کرنا ہے۔ چنانچہ انفال صاحب سے مشورہ ضروری تھا' ظاہر ہے یہاں مجھ پر پابندیاں تو عائد نہیں ہوسکتی تھیں' میں نے دادا جان سے باہر جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے خلوص دل سے اجازت دے دی۔

"چاہو تو ڈرائیور ساتھ لے لو بیٹے۔" انہوں نے مجھے مشورہ دیا۔

"نہیں دادا جان کیا ضروری ہے۔ میں بہر صورت اپنے وطن کی گلیوں' سڑکوں سے ناواقف نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا اور دادا جان نے گردن ہلادی۔

"میں نے ایک ملازم کو گاڑی گیراج سے باہر نکالنے کا حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے باہر نکل آیا کار ڈرائیونگ میں' میں ابھی خود کو مشاق نہیں کہہ سکتا تھا' لیکن بہرصورت فوزیہ نے مجھے اچھی خاصی ڈرائیونگ سکھا دی تھی' چنانچہ بڑے پر اعتماد انداز میں کوشش تو نہیں کر رہا' لیکن ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا یہ تو صرف میرا اپنا خیال تھا۔

انفال صاحب دراصل خود کو مجھ سے رابطے کے لئے چھپانا چاہتے تھے اس لئے میں نے یہ احتیاط ضروری سمجھی تھی دیر تک میں ادھر ادھر چکراتا رہا۔ پھر انفال صاحب کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔



ان کے مکان کے سامنے گاڑی روک کر میں اتر آیا۔ اور دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی فوزیہ ہی تھی ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس اور بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ لڑکی سے میری اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی' اس لئے یہ مجھے پسند بھی تھی' مجھے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اور پورا دروازہ کھول دیا۔

"اوہ آ' آ جاؤ' اندر آ جاؤ۔ آؤ' اندر آ جاؤ۔" اس نے بے اختیار ہو کر کہا اور

میں مسکراتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ فوزیہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "کیسے ہو ہارون؟"

"ٹھیک ہوں' ظاہر ہے تمہارا زیر تربیت رہ چکا ہوں اس لئے ٹھیک نہ ہونے کا کیا سوال ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور فوزیہ میری اس بے تکی بات پر ہنس پڑی۔

"آؤ دوسرے کمرے میں چلو۔" اس نے کہا اور مجھے لئے ہوئے دوسرے کمرے میں چل پڑی' افضال صاحب کا یہ مکان خاصا خوبصورت تھا۔ ضروریات زندگی کی تمام چیزیں یہاں موجود تھیں ویسے بھی ان کی حیثیت کے بارے میں' میں نے اندازہ لگایا تھا' وہ دادا جان کے ٹکڑوں پر پلنے والے نہیں تھے بلکہ اپنے طور پر بھی بہت کچھ تھے اور انہوں نے جو کچھ خرچ کیا تھا وہ بھی اپنی جیب سے ہی کیا تھا اور یہ رقم معمولی نہیں تھی۔

"فوزیہ مجھے لے کر اندر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی اور بڑے پیار سے بٹھایا۔" ماشاء اللہ تمہاری تو شخصیت ہی بدل گئی ہے۔"

"شخصیت بدلنے والے کون لوگ ہی یہ آپ نے غور نہیں کیا مس فوزیہ۔" میں نے کہا۔

"نہیں ہارون بعض لوگوں میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ صرف ان صلاحیتوں کو چمکانے کی بات ہے' ہم نے تو صرف وہ کام کیا ہے۔"

"لیکن افسوس فوزیہ میں اپنی ذات میں کچھ نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں ہارون ہونے کی حیثیت سے تو ایک نمایاں مقام رکھتا ہوں لیکن سردار علی ہونے کی حیثیت سے کچھ نہیں ہوں۔"

"یہ سردار علی کون ہے؟" فوزیہ نے متبسم انداز میں پوچھا۔ ایسی شخصیت جسے کوئی نہیں جان سکتا اور جو جاننے کے قابل بھی نہیں تھے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو ہارون۔ تم نجانے کیسی باتیں کر رہے ہو۔؟ اس انداز میں کیوں سوچ رہے ہو؟"

"فوزیہ ہر شخص پیدا ہونے کے بعد ایک نام پاتا ہے اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اچھائیاں برائیاں اس کی ذات میں جو کچھ بھی ہوتی ہیں سب اسی نام سے منسوب ہوتی ہیں اور زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہو کر جہاں نام کی تبدیلی کانوں سے آشنا ہو' اگر اس کی حیثیت ایک دم بدل دی جائے تو کیا یہ اس کے لئے تکلیف دہ بات نہیں ہے۔"

"اب ایسی تکلیف دے بھی نہیں ہے۔ آخر اس میں حرج کیا ہوگیا۔ تم سردار کی بجائے ہارون ہو۔"

"صرف اتنی سی بات نہیں ہے فوزیہ!"

"پھر؟"

"میں سردار کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ سردار کی بات بھی تو نہیں رہی ہے مجھ میں۔ ہارون بن کر میں لوگوں میں مقبولیت رکھتا ہوں اگر آج میں اپنے آپ کو سردار بنا کر پیش کردوں تو مجھے یقین ہے کہ کوئی میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔"

"لیکن میں کہتی ہوں۔ پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"میں نے کہانا۔ میرے اندر کا سردار ابھی تک نہیں مرسکا۔"

"تم اسے مارو بھی نہیں ہارون۔ وہ تو بس چند لمحات کے لئے سو گیا ہے۔ دادا جان بالکل ٹھیک ہو جائیں اس کے بعد کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا!"

"خیر چھوڑو۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "افضال صاحب کہاں ہیں۔"؟

"اس وقت موجود نہیں ہیں' کہیں گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے شاید واپس آجائیں۔ تمہیں جلدی تو نہیں ہے۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ ظاہر ہے میرے اوپر کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ' کس کے ساتھ آئے ہو؟"

"تنہا آیا ہوں۔"

"اوہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے؟"

"ہاں!"

"ذرا میں بھی تو دیکھتی کیسے گاڑی چلاتے ہو؟"

"تنہا چلو ساتھ چلتے ہیں' کہیں گھوم پھر آئیں پھر دیکھ لینا۔"

"اوہ نہیں' ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔" فوزیہ نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔

"کیوں؟"

"بس ہارون ابھی مجھے تمہارے ساتھ نہیں دیکھا جانا چاہئے۔ حالات ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ہمیں بہت آگے بڑھ کر ایک دوسرے سے شناسائی کا اظہار کرنا ہوگا!"

"میں نہیں سمجھا فوزیہ۔" میں نے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو ہارون۔ حالات ابھی ہمارے موافق نہیں ہیں' تم نے کم از کم اس دوران یہ اندازہ تو لگایا ہوگا کہ افضال صاحب کے لئے اس گھر کے لوگوں کے دلوں میں کیا جذبات ہیں۔"

"ہاں میں اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"بس وہ لوگ افضال صاحب کو پسند نہیں کرتے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی وجہ ان لوگوں کا رشتہ ہے' حالانکہ ان کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے یکن بس وہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔"

"خود کبھی افضال صاحب نے اپنے آپ کو ان میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"شاید کی تھی لیکن ناکام رہے۔"

"وہاں ان کے شدید مخالفین موجود ہیں' بلکہ تم یہ سمجھ لو کہ وہاں ان کا کوئی ہمدرد ہے ہی نہیں۔ البتہ دادا جان اپنی فطرت سے ذرا مختلف انسان ہیں۔ وہ کسی انسان سے نفرت کر ہی نہیں سکتے۔

"ویسے تم سناؤ کیسی رہی تمہارے ساتھ؟"

"بہت عمدہ یعنی حسب توقع۔"

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ یوں سمجھو تم فوزیہ' افضال صاحب نے جو حالات مجھے بتائے تھے ان کے مطابق۔ مگر چند باتوں پر مجھے حیرت ہے؟" "کیا۔ کونسی بات۔؟" فوزیہ نے پوچھا۔

" افضال صاحب تو مسعود صاحب کے لئے اتنے نیک جذبات رکھتے ہیں کہ ان کی بیماری دور کرنے لئے انہوں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا اپنی ذات پر الجھنیں مول لیں اپنی دولت خرچ کی لیکن وہاں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

"ہارون ابھی یہ نہ معلوم کرو تو بہتر ہے۔" فوزیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

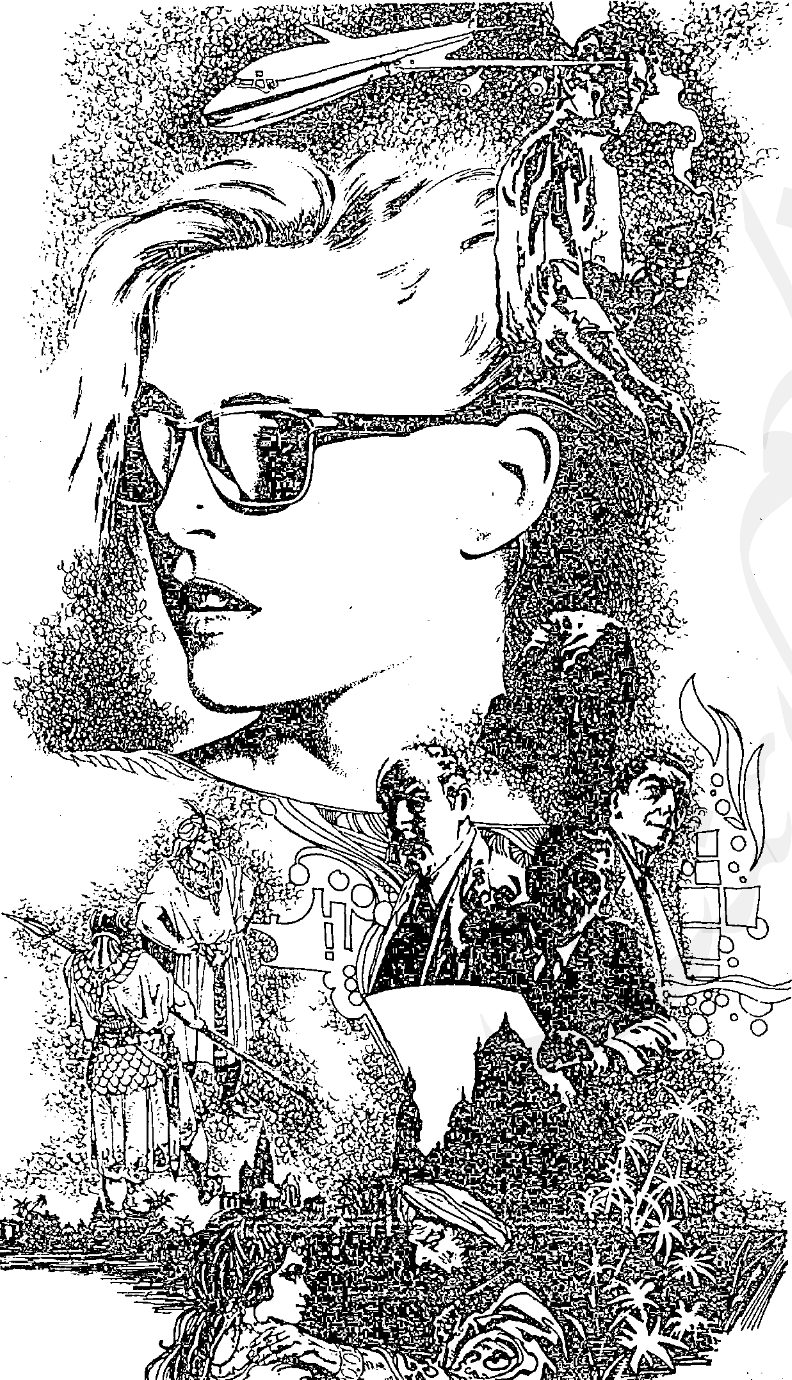
"میں نے کہانا میں ابھی تمہیں یہ حالات نہیں بتا سکتی' نا ہی مجھے اس کی اجازات ہے۔"

"تعجب کی بات ہے' کس کی طرف سے اجازت نہیں ہے!"

"پلیز ہارون مجھ سے اس سلسلے میں سوالات نہ کرو' ممکن ہے بہت جلد تمہیں حقیقت معلوم چل جائے۔"

"کوئی بہت گہری بات ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں کیوں نہیں' یہ دور فرشتوں کا دور نہیں ہے' اس دنیا میں انسان بستے ہیں فرشتے نہیں' ہر شخص کا ایک مقصد ہوتا ہے' ہر شخص کی ذات میں ایک خاص گہرائی پوشیدہ ہوتی ہے' جسے وہ دوسروں سے چھپائے رکھتا ہے۔ ممکن ہے افضال صاحب کے ذہن میں بھی



ایسی کوئی بات ہو۔"

"مگر.... مگر فوزیہ اگر ایسی کوئی بات ہے تو تمہیں تو مجھے بتا دینی چاہئے۔" میں نے کہا۔ اور وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"نہیں ہارون میں نہیں بتا سکتی اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تفصیل معلوم ہی نہیں ہے، بہرحال ان قصوں میں کیا رکھا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ضرور ہوگا اور تمہارے سامنے آ جائے گا وقت قریب ہی ہے ہارون۔ ہاں یہ بتاؤ کہ وہاں کون کون تمہارے ساتھ کس طرح پیش آیا۔؟"

"واہ اب تو میں اتنے آرام سے یہ بات نہیں بتا سکوں گا۔"

"کیوں کیوں۔"؟ فوزیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے میرے ذہن کو الجھا دیا ہے۔"

"ہارون میں معافی چاہتی ہوں پلیز مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پریشان نہیں کرو گے۔" فوزیہ نے کہا اور متعجبانہ انداز میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر پھوپی زلیخا ماموں تصدق اور دوسرے تمام افراد کے بارے میں بتایا.... آخر میں شازیہ کا ذکر بھی کیا۔

"کیا تم شازیہ سے واقف ہو؟" میں نے فوزیہ سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں، پھوپی کی لڑکی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"کوئی خاص بات؟" فوزیہ نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"بس کچھ نہیں، ان کا خیال ہے میں ان سے عشق کرتا تھا!"

"شازیہ سے۔؟"

"ہاں۔"

"کمال ہے! یہ عشق کب شروع ہوا؟" فوزیہ نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے میں نہیں جانتا۔ لیکن شازیہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ میں انہیں خطوط بھی لکھتا رہا ہوں اور یورپ میں۔ میں بس ان کی یادوں کے سہارے زندہ تھا۔"

"بکواس کرتی ہے کمینی کہیں کی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فوزیہ دانت پیس کر بولی۔

"تمہیں تو معلوم ہوگا فوزیہ؟ کیا ہارون یہاں کسی کی ذات سے منسلک تھا۔؟"

"میں نے کہا نا بالکل نہیں، یہ سب بکواس ہے، میرا خیال ہے اس لڑکی نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔"

"کیسی کوشش فوزیہ؟"

"تم بھی بہت سیدھے ہو' بھئی وہ سوچ رہی ہوگی کہ تم ذہنی طور پر تو کمزور ہو ہی چکے ہو اس لئے کیوں نہ وہ اپنی ذات کو مسلط کرنے کی کوشش کرے۔"

"اوہ۔ ممکن ہے یہی بات ہو' میں نے بھی اس کا مذاق ہی اڑایا تھا!"

"سچ کہہ رہے ہو ہارون۔" فوزیہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم نے اس کی پذیرائی تو نہیں کی؟"

"اوہ۔ نہیں فوزیہ۔ ظاہر ہے میں ان تمام باتوں کے لئے تو اس عمارت میں داخل نہیں ہوا۔" میں نے جواب دیا اور فوزیہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی' پھر پرخیال انداز میں بولی۔

"بہرحال وہاں تمہاری حیثیت مستحکم ہے' تم جو کچھ بھی کرنا چاہو گے تمہیں کوئی روکنے والا نہیں ہوگا' بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اب ہر شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ تم سے زیادہ سے زیادہ نزدیک ہو جائے۔ یہ لوگ جو پروگرام بنا رہے ہیں اس میں تو ناکام ہو چکے ہیں۔ بلکہ میں تمہیں مشورہ دوں ہارون' اگر تم پسند کرو تو ایک کام کرو!"

"وہ کیا جناب؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم ان لوگوں کی باتیں چھپ کر سننے کی کوشش کرو' سب ماتم کناں ہوں گے۔ کیونکہ ان کے مقاصد رکھے کے رکھے رہ گئے' جو کچھ چاہتے تھے اس میں ناکام ہوگئے' اور ظاہر ہے اس بات کا تعلق معمولی نہ ہوگا!"

"ممکن ہے فوزیہ' لیکن مجھے ان تمام باتوں سے کیا غرض!"

"یہ تو نہ کہو ہارون' غرض تو ہے۔"

"کیوں' بھلا مجھے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ میں تو افضال صاحب کے لئے کام کر رہا ہوں۔ جب تک وہ چاہیں گے مجھے استعمال کریں گے اور جب منع کر دیں گے تو میں خاموشی سے اپنا راستہ ناپوں گا۔ میں تم لوگوں کا اتنا احسان مند ہوں فوزیہ کہ میں تمہارے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"فوزیہ پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی' اس پریشانی کا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر تھا میں اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہا تھا پھر کبھی کبھی اس کے چہرے پر الجھن کے یہ آثار کیوں نمودار ہو جاتے تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا بناؤں تمہارے لئے' چائے یا کوئی ٹھنڈی چیز۔" کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"ضروری نہیں ہے فوزیہ۔ رہنے دو۔"

"نہیں کچھ تو؟"

"میرا خیال ہے تم چائے بنانے چلی جاؤ گی اور میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔ اس لئے صرف بیٹھو۔" میں نے کہا اور وہ مجھے دیکھنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"گریس تو یاد نہیں آتی؟"

"کیا؟"

"تم باتیں بہت اچھی کرنے لگے ہو!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کوئی قریب ترین شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم وہ تھوڑے عرصے پہلے کے سردار علی ہو۔ میرا مطلب ہے ہارون ہو۔" فوزیہ جلدی سے بولی' شاید وہ اپنے منہ سے سردار علی کا لفظ نکالنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

"یہ سب بھی تم لوگوں کا ہی عطیہ ہے اور بہرصورت یہ ایسا احسان ہوگا میری ذات پر جو ہمیشہ قائم رہے گا!"

"صرف یہ؟" فوزیہ نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ ہاں فوزیہ' صرف یہی نہیں بلکہ تمہارے دوسرے احسانات بھی یاد رہیں گے۔ مثلاً میری بہنوں کے سلسلے میں تم نے جو کچھ کیا ہے ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور بیچارے غیاث کی زندگی تمہاری وجہ سے سنور گئی۔ کیا یہ معمولی بات ہے۔"

"بس۔" فوزیہ نے پھر اسی انداز میں دیکھا۔

"اور کیا فوزیہ؟" میں نے سوال کیا اور اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ فوزیہ جلدی سے اٹھ گئی۔ "شاید افضال صاحب آگئے۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

مجھے اسی بات پر ہلکی سی حیرت ہوئی تھی' فوزیہ افضال کو باپ کی طرح محسوس نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے انداز میں ایک بے حجابی سی تھی۔ باپ بیٹی کتنے ہی جدید کیوں نہ ہوں لیکن باپ کا احترام ہوتا ہے جو ہر حال میں ذہن کے گوشوں میں اترا ہوتا ہے۔ لیکن فوزیہ اکثر مجھے اس احترام سے الگ نظر آئی تھی نجانے کیوں افضال صاحب اندر آگئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اندر آکر انہوں نے نہایت تپاک سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ بیٹھو ہارون میاں بیٹھو انہوں نے مسکرا کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اب تو تم بہت بڑے آدمی ہوگئے!

افضال صاحب آپ بھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی سیٹھ ہارون ذرا باہر تو نکل کر دیکھو' تمہارے بارے میں کاروباری حلقوں

میں دھوم مچ گئی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارا پیسہ مختلف کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بعض لوگ تمہاری موت کے بعد یقینی طور پر یہ سوچ کر بیٹھے ہوں گے کہ تمہارے پیسے کو آسانی سے ہڑپ کر جائیں گے' ظاہر ہے مسعود صاحب تو پورے طور پر حساب کتاب نہیں رکھ سکتے لیکن اب ان کے دلوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ میں کئی ایسے لوگوں سے مل چکا ہوں جو ہر طرح تمہارے احسان مند ہیں' وہ تمہارے بچ جانے کی خوشی کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن' اندر کا حال بھی ان کے چہروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔" میں ہنسنے لگا۔

"لیکن افضال صاحب مجھے ان تمام باتوں سے کیا تعلق؟"

"ہارون میاں تعلق تو ہے۔ اور رہے گا۔"

"کیسے۔ میں یہ نہیں سمجھا؟"

"ہوں!" افضال صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "وقت سے پہلے سمجھ لینا چاہتے ہو ہارون۔" انہوں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"وقت سے پہلے۔؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں میرا تو یہ خیال تھا کہ تم ابھی قدم بہ قدم چلتے۔"

"افضال صاحب میں وہی کروں گا جو آپ فرما رہے ہیں اگر میرا یہ سوال ابھی مناسب نہیں ہے تو میں اسے واپس لیتا ہوں۔"

"میں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا اور افضال صاحب مسکرانے لگے۔

"تم جس قدر نفیس انسان ہو۔ میں بتا نہیں سکتا۔ نہ جانے کیوں میں تمہیں بیٹوں کی طرح چاہنے لگا ہوں۔ اتنی محبت ہے مجھے تم سے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"مجھے احساس ہے افضال صاحب۔ یہ بات میرے سینے میں ہے۔"

"ہارون میں۔ دنیا میں ہر شخص ایک خوف کا شکار رہتا ہے۔ یہ خوف اس کے کسی جرم کی وجہ نہیں ہوتا۔ بس یہ انسان عجیب چیز ہے۔"

"جی۔" میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ افضال صاحب کسی قدر الجھے الجھے سے تھے' یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خاص بات کہنے والے ہوں اور اس کے لئے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ ابھی کہا جائے یا نہ کہا جائے تھوڑی دیر تک تو وہ خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔ میں بھی ان کی صورت دیکھتا رہا تھا پھر انہوں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہیں کئی دن گزر گئے' کیا اس دوران تم نے ان تمام لوگوں کا تجزیہ کیا ہے جو تمہارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں۔"

"مثلاً۔؟" میں نے سوال کیا۔

"میں مسعود صاحب کے عزیزوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"جی ہاں میں نے سبھی سے ملاقات کی ہے۔"

"ہارون بیٹے تم ایک سیدھے سادے انسان ہو۔ میں جانتا ہوں مکروفریب سے کبھی تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن میرا خیال ہے میں نے اب تک تمہیں جو تربیت دی ہے اس کے تحت تمہارے اندر بے شمار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں' کیا تم اس دنیا کو سمجھنے کے قابل ہو سکے ہو۔" افضال صاحب نے سوال کیا۔

"میں نہیں کہہ سکتا افضال صاحب' واقعی دنیا سے میرا زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ لیکن جہاں تک مکروفریب کی بات ہے بیشک مجھے اس تھوڑی سی زندگی میں طویل تجربات ہوئے ہیں۔"

"مثلاً افضال صاحب جس وقت میں دیہات سے چلا تھا تو دل میں بہت سی امنگیں اور آرزوئیں تھیں۔ نجانے کیا کیا ارادے تھے۔ جب میں کراچی پہنچا تو میرے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے میری آنکھیں کھول دیں' میرا ایسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا جو اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ تھے۔ میں سخت حیران تھا لیکن آہستہ آہستہ مجھے بہت کچھ آگیا اور پھر آپ نے تو باقی کسر بھی پوری کر دی۔"

"یعنی؟"

"آپ کے ساتھ رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"مثلاً؟"

"امتحان لے لیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تیار ہو؟"

"جی ہاں!"

"تو سوال تو میں کر چکا ہوں۔ یوں سمجھو پورا امتحانی پرچہ یہی ہے۔" "افضال صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"افضال مجھے کہنا تو نہیں چاہئے۔ حق بھی نہیں ہے مجھے آپ اس خاندان کے بہی خواہ ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کثیر رقم خرچ کرکے مسعود صاحب کی زندگی کی کوشش کی ہے' آپ دور رہ کر بھی ان کی بہتری کے خواہاں ہیں۔ جبکہ وہ لوگ جو ان کے سینے پر بیٹھے ہوئے ہیں دل میں لالچ اور ہوس رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو مسعود صاحب سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"افضال صاحب یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑے۔ "ہارون۔ ہارون تم ان باتوں کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"کیوں نہیں افضال صاحب!"

"پاس امتحان میں پاس۔" افضال صاحب خوشی سے چیخے اور مسکرانے لگا۔ افضال صاحب دلچسپی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے ان لوگوں کا تجزیہ کر لیا ہے۔"؟"

"جی ہاں!"

"بہت خوب واقعی کمال ہے!"

"نہیں افضال صاحب اس میں کمال کی کیا بات ہے۔ وہ اب اپنے خول سے کبھی کبھی نکل آتے ہیں۔ اور بے نقاب ہو جاتے ہیں' ایک واقعہ میں مس فوزیہ کو سنا چکا ہوں۔ زلیخا پھوپی کی صاحبزادی ہیں شازیہ۔ ان کا خیال ہے کہ میں ان سے عشق کرتا تھا اور اب اپنی یادداشت کی گمشدگی کی بناء پر یہ بات بھول گیا ہوں وہ مجھے بہت کچھ یاد دلانا چاہتی ہیں۔ مگر ان کے پاس میری اس محبت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جو میں ان سے کرتا تھا۔ افضال صاحب میں جانتا ہوں۔ یہ لوگ میری بے جا خوشامدیں کرتے ہیں۔ اور اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ لوگ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میری توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں کسی کی پذیرائی نہیں کر سکتا' اول تو یہ کہ میں مناسب نہیں سمجھتا' دوسری بات یہ کہ خود میری حیثیت وہ نہیں ہے جو وہ لوگ سمجھتے ہیں۔ میں تو وہاں صرف آپ کے مفادات کی نگرانی کرنے کے لئے موجود ہوں؟"

"ہارون بیٹے! ہارون بیٹے تمہاری باتیں سن کر میں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں' تم اتنے نیک اور سعادت مند شخص نکلو گے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یقین کرو میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھادوں۔ میں تمہیں وہ کچھ دینا چاہتا ہوں میرے بچے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے یہ حرام خور مسعود صاحب کے سینے پر بیٹھے ہوئے انہی کا کھا رہے ہیں اور انہی کی زندگی کے خواہاں ہیں سب کے سب نمک حرام ہیں یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مسعود صاحب کو اپنی مٹھی میں لے لیں۔ جب تمہاری موت کی اطلاع ملی تھی تو ان سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے ان سب کی دلی خواہش تھی کہ مسعود صاحب انہیں اپنی زندگی میں کوئی ایسا مقام دے جائیں کہ اس کے بعد ان کی ساری دولت پر وہ تازندگی عیش کر سکیں' لیکن صرف میں تھا جس کے دل میں یہ خواہش تھی یہ آرزو تھی کہ مسعود صاحب ہوش و حواس میں واپس آئیں اور جو فیصلہ کریں' یہ سب ان کے گرد اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ مسعود صاحب کو سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی' بیٹے تم انہیں احساس دلاؤ کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کریں اور ان کمینوں کے نرغے میں سے نکل جائیں۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کروں افضال صاحب؟" میں نے سوال کیا۔

"تم ابتداء یہاں سے کرو ہارون کہ سب سے پہلے تم اپنی جائیداد اور تمام دولت کے بارے میں مسعود صاحب سے گفتگو کرو۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ براہ راست ان سے الجھو۔ لیکن جو کچھ کرو مسعود صاحب کے ذریعے کرو اور اگر ان کی اجازت مل جائے تو پھر ان سب سے ایک ایک پائی کا حساب لو۔ میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"

"اوہ۔ وہ کس طرح؟"

"اگر مسعود صاحب تمہیں اجازت دیدیتے ہیں تو پھر میں تمہیں ایک آدمی مہیا کروں گا اس کا تذکرہ بھی تم مسعود صاحب سے کر دینا۔ یہ شخص میری رہنمائی میں ان لوگوں کا پول کھول دے گا اور تم ان سے ایک ایک پائی نکلوا لینا۔"

"اور اگر مسعود صاحب نے یہ پسند نہ کیا تو؟"

"یہ تمہارا کام ہوگا ہارون کہ تم انہیں مجبور کرو۔"

"بہتر ہے' میں کوشش کروں گا! پھر اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا!"

"ان سب کو ان کی اوقات پر پہنچا دینا تمہارا کام ہوگا!"

"مسعود صاحب شاید یہ پسند نہ کریں۔"

"کیوں؟"

"وہ بے حد رحمدل انسان ہیں۔ وہ ان کی پرورش کرنے کے خواہشمند ہیں!"

"تم سب سے پہلی کوشش یہ کرو گے کہ مسعود صاحب ساری جائیداد وغیرہ تمہارے نام کر دیں اس کے بعد تم یہ نظام سنبھال لینا مسعود صاحب کو تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں تم ان سے نمٹ سکتے ہو۔"

"ہوں۔ کیا میں ان سے صاف گفتگو کرلوں؟"

"ہاں۔ اگر وہ نہ مانیں تو۔ تو واپس لندن چلے جانے کی دھمکی دے دینا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ویسے افضال صاحب کی بات بہت سخت تھی۔ مسعود صاحب جیسے فرشتہ سیرت انسان کی ساتھ کوئی سخت رویہ عام بات نہ تھی۔ میں خود کو اس کے لئے بمشکل ہی تیار کر سکتا تھا۔ لیکن بہرحال افضال صاحب کا حکم تھا اور میں تو جو کچھ کر رہا تھا انہیں کے ایماء پر کر رہا تھا اس لئے میں ان کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔"

"فوزیہ بیٹے! خاطر نہیں کرو گی ہارون میاں کی!"

"جی ابو۔ کیا لاؤں؟"

"چائے بنا لاؤ۔ کیوں ہارون میاں؟"

"جیسا آپ پسند کریں۔" میں نے شانے ہلا دیئے۔ میں کسی قدر منفعل سا ہو گیا تھا۔ بس احساس سے پریشان تھا کہ مسعود صاحب سے یہ گفتگو کس طرح کروں گا!"

"فوزیہ چائے بنا لائی اور ہم تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ تب افضال صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"ویسے وہاں کیا کہہ کر آئے ہو؟" کچھ نہیں، بس میں نے مسعود صاحب سے کہہ دیا تھا کہ چند پرانے دوستوں کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

"بہت اچھا کیا.... اور اکثر آتے رہا کرو۔ بلکہ آنے کے لئے وقت دے جایا کرو یہ بتاؤ اب کب آؤ گے؟"

"جب آپ حکم دیں افضال صاحب۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں۔ میرا خیال ہے ہر تیسرے دن ٹھیک رہے گا۔ دو دن تمہیں کام کرنے کے لئے مل جائیں گے اور اس کے بعد میں تمہیں کام کرنے کے لئے احکامات دے دیا کروں گا، کیوں فوزیہ ٹھیک ہے نا۔" افضال صاحب نے فوزیہ سے تائید چاہی۔ اور فوزیہ نے بے اختیار گردن ہلادی۔ نجانے کیوں فوزیہ کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے، ایسے تاثرات جنہیں میں کوئی معنی نہیں پہنا سکتا تھا۔ پھر میں نے افضال صاحب سے اجازت چاہی اور افضال صاحب نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

"فوزیہ انہیں دروازے تک چھوڑ آؤ۔" انہوں نے کہا اور فوزیہ میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ تب وہ بولی۔

"کب آئیں گے اب؟"

"تین دن کے بعد۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔ ویسے ہارون صاحب ایک بات کہوں؟"

"ضرور فوزیہ۔"

"اب۔ آپ میری امانت ہیں، کسی کے جال میں نہ پھنس جائیں۔" فوزیہ نے کہا اور دروازے سے واپس چلی گئی۔ میں چند ساعت تو حیران کھڑا رہا۔ پھر کار کی طرف بڑھ گیا۔ فوزیہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور اب میں سیدھا سادا دیہاتی نہیں تھا۔ میں ان الفاظ کی گہرائی سمجھتا تھا۔



"کوٹھی میں داخل ہوا تو طاہرہ نظر آگئی، کسی قدر الہڑ لڑکی تھی۔ طبیعت میں بھی صاف گوئی تھی اور یہ لڑکی یہاں کے دوسرے لوگوں کی طرح میری چاپلوسی نہیں کرتی تھی، نا ہی ہر وقت مجھے دیکھ کر سہمے سے انداز میں مسکراتی رہتی تھی، بلکہ ایک طرح کا اکھڑپن سا تھا اس میں، مجھے ملی تو کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔"

"کہاں سے تشریف لا رہے ہیں جناب والا۔؟"

"اوہ خیریت۔ یوں لگتا ہے جیسے لڑنے کے لئے تیار ہو۔"

"جی نہیں، آپ سے بھلا کون لڑ سکتا ہے۔" وہ بدستور نخریلے انداز میں بولی۔

"کیوں، کیوں نہیں لڑ سکتا؟"

"جہاں پناہ جو ہیں آپ۔" اس نے جواب دیا۔

"واہ یہ کوئی نیا خطاب ہے؟"

"نہیں خطاب کیا۔ تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں۔" طاہرہ نے جواب دیا۔

"خیر جناب سمجھتے ہوں گے۔ آپ فرمایئے یہ لڑائی کا موڈ کیوں بنا ہوا ہے۔؟"

"نہیں نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، اوہو مجھے تو اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنی چاہئے تھی، سوری جہاں پناہ ذرا سی غلطی ہوگئی۔" طاہرہ نے کہا اور میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا، اندر جانے کی بجائے اگر باغ کے گوشے میں چلیں تو بڑی عنایت ہوگی۔"

"خیریت.... آپ تو بڑے مشینی انداز میں بول رہی ہیں۔"

"ہاں کیا کروں، دراصل حافظہ بہت خراب ہے، بہت ساری باتیں یاد نہیں رہتیں، بڑی مشکل سے ریہرسل کرائی گئی ہے۔ مجھے اور بس آپ چلئے ورنہ ممکن ہے میں کچھ بھول بھی جاؤں۔" طاہرہ نے کہا اور متحیرانہ انداز میں اس کی شکل دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد میں باغ کے اس گوشے میں تھا جہاں ایک بار میری ملاقات شازیہ سے ہو چکی تھی اور جو اس دن کے بعد مستقل مجھ پر مسکراہٹوں کے تیر برساتی رہتی تھی۔

"بیٹھ جایئے۔" طاہرہ نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ مسکرانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے مجھ سے بولی۔ "جی فرمایئے۔" اس نے کہا اور میں تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"میں کیا فرماؤں؟"

"ارے ارے دیکھنا پھر بھول گئی، دراصل فرمانا مجھے ہے، ہاں تو آپ یہ بتایئے کہ یورپ میں کبھی آپ نے کسی سے محبت کی؟"

"جی۔" میں تعجب سے بولا۔

"نہیں کی۔"

"میں نے تو نہیں کی اور نہ میں سمجھ پا رہا ہوں کہ آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں۔"

"بھئی جواب دیتے رہیے آپ کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے، مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ میں آپ کو کچھ بولنے کا موقع نہ دوں۔"

"کس نے کہا ہے آپ سے یہ سب کچھ۔"

"سوری اس کا جواب بھی نہیں دیا جاسکتا۔" طاہرہ بولی۔

"طاہرہ آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں۔"

"آپ نے واپس آ کر خود سب کو پریشان کر دیا ہے۔ بھلا کیا ضرورت تھی واپس

آنے کی۔ نہ جانے کس کس کی دعاؤں سے تو آپ مرے تھے اور نہ جانے کس کس کی بد دعا سے زندہ ہوگئے۔" طاہرہ ناک چڑھا کر بولی۔ میں احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"آپ نہ جانے کیا کہہ رہی ہیں۔ میری سمجھ میں بخدا کچھ نہیں آ رہا۔"

"میں جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دیتے رہیں۔ آپ کو سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے' ہاں تو آپ نے یورپ میں کسی سے محبت کی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہاں کس سے شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"کیا شازیہ کی نگاہوں کے تیر بے اثر رہے ہیں۔؟"

"قطعی۔؟ میں نے جواب دیا۔"

"بہت خوب سمجھداری کی بات کی ہے۔ اب ذرا دوسری بات بتائیے۔"

"وہ کیا؟"

"میرے لئے کوئی چانس ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟" اس نے سوال کیا۔ بڑی تیز لڑکی تھی لیکن کھری گفتگو کر سکتی تھی اور یہ بات اس کی شروع سے اب تک پسند تھی۔

"بس مناسب لگتی ہو۔"

"یہ مناسب اتنا ہے کہ آپ مجھ سے عشق کرنے لگیں۔ میرا مطلب ہے اگر میں کوشش کروں تو؟" اس نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے آپ کی گفتگو مناسب نہیں۔" مس طاہرہ۔"

"قطعی مناسب ہے کیونکہ والدین جو ہدایات دیتے ہیں وہ جیسی بھی ہوں مناسب ہوتی ہیں۔ اب آپ اس گفتگو کا پس منظر سمجھ لیں۔ آپ مر چکے تھے اور نانا میاں کی موت کا انتظار کیا جا رہا تھا' کیونکہ اس کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ ان کی جائیداد تقسیم ہو جائے گی ان لوگوں میں اور وہ لوگ اس لئے مطمئن تھے کہ جائیداد کے خواہ کتنے ہی حصے ہوں ہر ایک کو اتنا ملے گا کہ اس کے دلدر دور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس پر لوگوں نے قناعت کر لی تھی اور یہ سن کر پرسکون ہوگئے تھے کہ بہرصورت آج نہ سہی کل نانا میاں مریں گے اور ہمارا کام بن جائے گا۔ لیکن آپ پھر اچانک زندہ ہو کر وارد ہوگئے اور ایک ہلچل مچ گئی۔ میں کیا بتاؤں جن چہروں پر آپ کے لئے خوشیاں سجی ہوئی

تھیں ان کے اندر کا کیا حال تھا۔ ہر ایک افسردہ اور ملول تھا۔ پھر ایک میٹنگ ہوئی اور اسی میٹنگ میں بیٹھ کر آئندہ صورت حال کے بارے میں سوچا گیا یہ طے کیا گیا کہ ہارون میاں تو سدا کے گاؤدی ہیں وہ ہمارے درمیان کیا مداخلت کریں گے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہماری امیدوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ یعنی ظاہر ہے اب تو جائیداد آپ ہی کو ملے گی' اور آپ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہیں کہ ہمیں اس طرح پرورش کریں جس طرح نانا میاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب غنیم دوسری چالیں سوچ کر سامنے آ رہا ہے۔ وہ لوگ خوش ہیں جن کی کوئی نہ کوئی بیٹی موجود ہے۔ جیسے خالہ زلیخا یا میری امی ناہید یا ماموں تصدق جنہوں نے فوراً اپنی بیٹی کو یہاں آنے کا تار دے دیا ہے۔"

"جی ہاں نادرہ صاحبہ شہر میں تعلیم حاصل کرتی ہیں" طاہرہ نے جواب دیا۔

"خوب تو پھر ان بیٹیوں کا کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا' سب کی سب آپ پر چاروں طرف سے جال ڈالیں گی' اب یہ شکاری کی قسمت ہے کہ مچھلی جس کے بھی جال میں پھنس جائے۔ کیا شازیہ اس کے لئے کوشش نہیں کر چکی۔" طاہرہ نے پوچھا اور میں سر کھجانے لگا۔ "آپ کو خدا کی قسم صحیح جواب دیں۔

"ہاں! لیکن اس نے تو ایک انوکھی بات کہی ہے؟"

"وہ کیا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ میں بچپن سے اسے چاہتا ہوں' اور اسے خط بھی لکھا کرتا تھا حالانکہ مجھے اک بھی خط یاد نہیں ہے۔"

"ہارون صاحب۔ کیا آپ لوگوں کو پتھر مارتے ہیں۔؟"

"نہیں۔"

"کسی طور اپنے آپ کو پاگل سمجھتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"آپ کے خیال سے کیا ہوتا ہے۔ یہ سب تو یہی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہوائی جہاز کے حادثے نے آپ کو بالکل ناکارہ کر دیا ہے' آپ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ جس نے ایک چھلانگ لگائی وہ خندق کے پار چلا جائے گا اور میرا خیال ہے اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش محترمہ شازیہ نے فرمائی ہے' انہیں جب ہدایات دی جا رہی تھیں تو اتفاق سے میں نے بھی سن لیا۔" ان سے کہا گیا تھا کہ وہ تمام تر کوشش اس بات کی کریں کہ ہارون کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ بہت پہلے سے شازیہ سے منسوب ہے' پھوپی زلیخا اکثر یہی کہتی ہیں کہ ہارون اور شازیہ تو پیدا ہی ایک دوسرے

کے لئے ہوئے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے میری ماں یعنی آپ کی پھوپی ناہید صاحبہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں' ان کا خیال ہے کہ اصل میں میری پیدائش آپ کے لئے ہوئی ہے۔ بلکہ یوں سمجھا جائے کہ مجھے پیدا ہی آپ کے لئے کیا گیا ہے۔ یہ شازیہ صاحبہ غلط فہمی میں ہمارے درمیان آکودی ہیں۔ ورنہ یہ صرف خالہ زلیخا کی غلط حرکات ہیں وہ شازیہ کو آپ سے منسوب کرنے کے لئے اوچھی حرکات کرتی ہیں۔ ورنہ آپ پر پہلا حق میرا اور صرف میرا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"جی ہاں جی ہاں۔ آپ پوری بات سنیں۔ میری محترمہ امی اور والد صاحب اس بات پر بضد ہیں کہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤں اور آپ کو اس طرح اپنے جال میں پھنساؤں جیسے مکڑی مکھی کو اپنے شکنجے میں کستی ہے۔ مجال ہے آپ کی کہ آپ ادھر ادھر دیکھ بھی لیں۔ دراصل میرے والدین کو میرے حسن پر بڑا ناز ہے۔ لیکن آئینہ میں دیکھتی ہوں وہ نہیں۔"

"طاہرہ صاحبہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"بالکل درست کہہ رہی ہوں۔ آپ کو پتہ ہے ہارون صاحب میں اس وقت یہاں کیوں آئی ہوں؟"

"جی۔"

"یہ سب مجھے تربیت دے کر کرایا گیا ہے پہلے مجھے ریہرسل کرائی گئی تھی کہ میں یوں مسکراؤں' یوں لچکوں اس طرح سے چال میں تبدیلی پیدا کروں' اس انداز سے بال باندھوں' اس طرح سے آپ کو دیکھوں کہ آپ کے سارے ہوش و حواس رخصت ہو جائیں اور اس کے بعد بس میں ہوں اور آپ ہوں آپ مجھے اپنی کار میں لئے سڑکوں پر گھومیں اور جب میں آپ کے سامنے نہ ہوں تو آپ دیوانہ وار مجھے تلاش کریں' آپ کسی سے گفتگو کریں تو کھوئے کھوئے لہجے میں' آپ کا انداز ایسا ہو کہ جیسے کوئی چیز گم ہوگئی ہو۔ اور یہ ساری باتیں مجھے کرنی ہیں۔ سمجھے جناب ہارون صاحب مجھے یہ سب کچھ کرنا ہے۔" طاہرہ نے کہا۔

"ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔" وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔

"کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ تمہارے خلاف کیا کچھ ہو رہا ہے؟"

"میرے خلاف؟"

"کیا ہو رہا ہے طاہرہ؟"

"تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ کیا واقعی تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"ہارون دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو پلیز سمجھو' ہارون' رشتے دار بلاشبہ قابل احترام ہوتے ہیں ان سے محبت بھی کی جاتی ہے لیکن جب اس محبت میں ایک نفرت انگیز لالچ بسا ہوا ہو تو پھر ہم اسے محبت نہیں کہہ سکتے' یہ محبت کے پاک نام کی توہین ہے' یہ سب ہوس کے غلام ہیں۔ ان سب کی خواہش ہے کہ کسی طرح سونے کی یہ کان ان سب کے ہاتھ میں آجائے۔ ہارون صاحب میں فرشتہ نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میں آپ کو کوئی دھوکہ دینا نہیں چاہتی' اب اگر کبھی کوئی آپ کو میرے لئے مجبور کرے تو آپ نفرت سے میرے منہ پر تھوک دیں' آپ یقین کریں اگر آپ نے ایسا کیا تو میں آپ کو عظیم انسان سمجھوں گی۔ آپ کو کسی بھی صورت اپنے ان نمک حرام رشتہ داروں کو ان کی مذموم سازشوں میں کامیاب نہیں ہونا دینا چاہئے۔"

"ہوں۔" میں نے دوسری گہری سانس لی۔ "طاہرہ آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟"

"کیا مطلب؟ کیا آپ مجھے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟"

"کیا ممکن ہے تیار ہو جاؤں!"

"لیکن جناب میں کبھی تیار نہیں ہوں گی۔" طاہرہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"آخر کیوں! جب آپ نے مجھے اپنا رازدار بنالیا ہے تو پھر اتنی سی بات بتانے میں گریز کیوں کر رہی ہیں؟"

"آپ کا کیا خیال ہے۔" طاہرہ نے چبھتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نہیں جانتا۔"

"میں سمجھتی ہوں آپ کے ذہن میں کیا خیال ہے؟"

"بھلا کیا؟"

"آپ کوئی فلمی کہانی سوچ رہے ہوں گے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ میں کسی غریب نوجوان کو چاہتی ہوں گی۔ میں نے اس سے شادی کا وعدہ کرلیا ہوگا اور اب اس کے لئے میں اپنے والدین کو رسوا کرکے ایک عظیم قربانی دے رہی ہوں اور یہ قربانی کتاب محبت میں خوبصورت الفاظ سے لکھی جائے گی۔"

"ممکن ہے ایسا ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا یورپ میں اب بھی ایسی فرسودہ فلمیں بنائی جاتی ہیں؟"

"تو آپ خود ہی بتادیں۔"

"بس ہارون صاحب۔ آپ مجھے اس لئے پسند نہیں ہیں کہ آپ بے حد دولت مند ہیں اور میرے والدین کو آپ نہیں آپ کی دولت پسند ہے' پھر میں اس دولت کے

حصول کا ذریعہ کیوں بنوں۔ معاف کیجئے گا میں اسے اپنی ذات کے لئے گالی سمجھتی ہوں۔ بعض والدین بیٹی کو دولت کی ترازو میں تول کر وہ بن جاتے ہیں جسے۔ عرف عام میں ہم بہت برا سمجھتے ہیں۔ میں اپنی ذات میں زندہ ہوں اور زندہ رہوں گی۔ میں کسی کے سنہری خوابوں کی تعبیر نہیں بنوں گی۔ سمجھے آپ۔"

"میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں طاہرہ۔"

"خلوص دل سے کہیں۔"

"اگر نانا میاں بھی اصرار کریں تب بھی آپ مجھ سے شادی کے لئے تیار نہ ہوں۔ ایک بار سچے دل سے مجھے بہن کہیں۔"

"ہاں طاہرہ تم میری بہن ہو سگی بہن۔"

"مرد کی زبان ایک ہوتی ہے نا؟"

"بھائی کی زبان بھی ایک ہوتی ہے۔"

"شکریہ۔ آپ نے میرے وجود کی عزت رکھ لی ہے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں۔" طاہرہ نے جذباتی آواز میں کہا' اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

"تشریف لایئے بہن صاحب۔ لاج رکھنا ہوگی اس رشتے کی۔"

"خدا کی قسم جان حاضر ہے۔" طاہرہ نے کہا۔ مجھے بھی اس سے بڑی اپنائیت محسوس ہوئی تھی' حالانکہ میں وہ نہیں تھا جو وہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن بہرحال اس روپ میں بھی وہ میرے لئے قابل احترام تھی' میں اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔

"تشریف رکھئے؟"

"شکریہ۔"

"اور کیا ہو رہا ہے یہاں میرے خلاف۔؟"

"یہ ناکارہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے' انہوں نے صرف بیٹیوں کا سہارا لیا ہے' اب سے چند دن پہلے وہ یکجا ہوگئے تھے' لیکن اب ان کے درمیان دوبارہ رقابتیں شروع ہوگئیں۔ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"اس سے زیادہ کچھ؟"

"نہیں اور کچھ نہیں۔"

"طاہرہ اب آپ اس گھر میں میری دست راست بن چکی ہیں۔ میں آپ پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ آپ کو میرے مفادات کی نگرانی کرنا ہوگی۔"

"ایک شرط ہے؟"

"بتائے بغیر منظور۔" میں نے کہا اور طاہرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اتنا اعتماد ہوگیا مجھ پر!" وہ بولی۔

"ہاں طاہرہ' ہر انسان کی زندگی میں صرف ایک لمحہ ہوتا ہے۔ صرف ایک لمحہ۔ جس میں اسے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ مجھے تمہاری محبت مل گئی ہے اور میں تم پر زندگی کا سب سے بڑا اعتماد کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"شرط سن لیں آپ۔" وہ بولی

"شرط نہیں۔ بہن کا حکم کہو۔"

"چلئے یہی سہی۔ تو میرا حکم ہے جناب کہ آپ کسی کے کتنا زور دینے پر بھی اس خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کریں گے۔ آپ جب بھی شادی کریں گے کسی باہر کی لڑکی سے' بلکہ میرا تو خیال ہے کہ کچھ عشق وشق کر ڈالیں' آپ کے لئے تو بڑے مواقع ہیں' کوئی اچھی سی لڑکی دیکھو' تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے' کسی غریب سی لڑکی کی زندگی کی تمام خوشیاں بخش دو جس نے نے کبھی کچھ نہ دیکھا ہو۔"

"طاہرہ میرے سینے میں ایک راز پوشیدہ ہے' ابھی نہیں بتاؤں گا' لیکن خدا کی قسم جسے میں یہ راز بتاؤں گا وہ ہستی صرف تو ہوگی۔"

"راز۔ کوئی بہت گہرا راز ہے کیا؟"

"ہاں طاہرہ' بہت ہی گہرا۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی جناب ہارون صاحب' بلکہ اسی اعتماد کے سہارے یہ بات کہہ رہی ہوں جو آپ نے مجھے ابھی ابھی بخشا ہے' آپ اگر اپنا کوئی راز فی الوقت مجھے نہیں بتا رہے تو یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہوگی اور میں اپنے بھیا کو مجبور نہیں کروں گی!"

"میں تمہارا بے حد شکرگزار ہوں طاہرہ۔ بلاشبہ تم عظیم ہو۔"

"بس بس' فضول باتیں بند۔ کوئی عظیم نہیں ہے' ہاں بہن ہونے کی حیثیت سے جو عظمت مجھے مل سکتی تھی وہ آپ نے عنایت فرمادی ہے' چنانچہ اتنا زیادہ بار نہ ڈالئے مجھ پر کہ میں سنبھل نہ سکوں۔ یعنی پاگل نہ ہو جاؤں اور سب سے پہلا پتھر آپ ہی کو ماروں۔" طاہرہ نے کہا پھر اٹھ کھڑی ہوئی اب مجھے اجازت دیں' نجانے لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

"بھائی مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ہر جنبش پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے لوگ بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں آپ کو بس یوں لگتا ہے جیسے کوئی چلتا پھرتا سونے کا پہاڑ ہو۔ جسے ہر شخص اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کے لئے تیار ہو۔ چنانچہ اس وقت آپ مجھے ساتھ لئے

ہوئے اپنی کمرہ خاص میں آئے ہیں' اس بات کی اتنی چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی کہ بس خدا کی پناہ اور میرے امی ابو۔ وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہوں گے وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو تعلیم اسی لئے دلائی ہے کہ وہ جس طرف بھی ہاتھ ڈالے کامیابی اس کی منتظر ہو۔" طاہرہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہے لوگوں کی غلط فہمیاں جلد ہی دور ہو جائیں گی۔" میں نے کہا اور طاہرہ کمرے سے نکل گئی۔

"میں عجیب سی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ بلاشبہ قابل احترام لڑکی تھی اس کا جتنا بھی احترام کیا جاتا کم ہے۔ اتنی صاف گو اتنی اچھی طبیعت کی مالک کہ بس پوجنے کو دل چاہے' اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا کہ طاہرہ کے لئے ہمیشہ بہتری سوچوں گا۔ جو غلطی کی ہے اس کے والدین نے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اس کے والدین کو بھی معاف کیا جاسکتا ہے۔ بہرصورت اس کے بعد میں افضال صاحب کے دوسرے حکم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں مسعود صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا اور وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے مسکرانے لگے۔

"گھوم آئے بیٹے؟"

"جی دادا جان!"

"کہاں کہاں گئے!"

"بس مختلف جگہوں پر۔"

"دوستوں سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں۔ جن لوگوں کے پاس گیا تھا پتہ چلا کہ وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔"

"اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا ان کے بارے میں کہ کہاں گئے؟"

"بہت پرانے شناسا تھے دادا جان نجانے بیچارے کہاں چلے گئے' بہرصورت اور بھی ہیں۔ ملتا ہی رہوں گا۔" میں نے کہا اور دادا جان مسکرانے لگے۔" میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتاہوں دادا جان!"

"ہاں ہاں ضرور۔"

"لیکن بالکل تنہائی میں۔"

"یہاں کون ہے اس وقت۔ اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی آجائے گا تو میں ملازم کو بلا کر ہدایت دے دیتا ہوں۔" دادا جان نے کہا اور ملازم کو بلانے کے لئے

گھنٹی بجا دی' یہ ملازم چوبیس گھنٹے ان کے دروازے پر موجود رہتا تھا۔ ملازم اندر آیا تو دادا جان نے اسے ہدایت کی کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے چاہے وہ کوئی ہو۔" پھر وہ مجھے دیکھنے لگے ان کی آنکھوں میں فخر وانبساط کی چمک تھی۔

"کہو بیٹے کیا کہنا چاہتے ہو۔؟" "دادا جان میں آپ کی نیک دلی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ وسیع القلب اور نہایت کشادہ ذہن کے مالک ہیں آپ کی سوچ میں عظمت ہے لیکن دادا جان کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ اس عظمت کو لوگ ناجائز طریقوں سے استعمال کریں۔"

"ہرگز نہیں' کون ہے کیا بات ہے کھل کر بتاؤ۔" دادا جان نے کہا۔

"کوئی نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ بس چند ضروری باتیں ہیں۔"

"کہو۔؟"

"جائیداد وغیرہ کا نگران کون ہے؟"

"اوہ' مختلف لوگ' تصدق زمینوں اور عمارتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہی کرائے وغیرہ وصول کرتا ہے۔ لاہور کی دو فیکٹریاں اسی کی زیر نگرانی ہیں۔ امجد علی کراچی کے دونوں مل چلا رہا ہے یہ کام مختلف لوگوں میں بٹے ہوئے ہیں۔"

"ان سب کے حسابات کون دیکھتا ہے؟"

"محمود علی۔ وہ جنرل منیجر ہے۔ اس کے علاوہ چند وکلاء ہیں اور بھی دوسرے لوگ ہیں۔ مگر یہ سوال کیوں کیا ہے تم نے ؟"

"دادا جان۔ میں ان تمام چیزوں کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ آج ہی میں نے فون پر جہانگیر سے بات کی ہے۔"

"جہانگیر کون ہے؟"

"ہمارا خاندانی وکیل۔ عزیزوں سے بڑھ کر ہے۔ جتنا ہمارا بھی خواہ وہ ہے اور کوئی نہیں۔ جہانگیر صاحب سے میں نے کہہ دیا ہے کہ انتظامات کرلے میں آخری کاروائی کرنا چاہتا ہوں یعنی تمہاری امانت تمہارے سپرد کردوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی بیٹے۔ لیکن تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا۔؟"

"میں یہاں کے رنگ ڈھنگ دوسرے دیکھ رہا ہوں دادا جان جہاں لوگوں کے دلوں میں محبت سے زیادہ ذلالچ ہے۔"

"یہ بات میں جانتا ہوں بیٹے اور خود بھی تم سے یہی کہنا چاہتا تھا۔ ان سب کی ضروریات کا خیال رکھو لیکن انہیں دوسرے مواقع نہ دو۔"

"ٹھیک ہے دادا جان۔ تو آپ ان لوگوں میں اعلان کر دیں۔"

"ضرور کردوں گا۔ بے فکر رہو۔" دادا جان نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ تب اچانک میں نے پوچھا۔

"دادا جان۔ افضال صاحب سے ہمارا کیا تعلق ہے؟"

"افضال صاحب؟" دادا جان چونک پڑے۔

"ہاں۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس کا تعلق ہمارے خون سے نہیں ہے۔"

"لیکن انہوں نے پرورش تو یہیں پائی ہے۔"

"ہاں بیٹے۔ لیکن اگر وہ کوئی نیک انسان ہوتا تو اسے بھی خاندان میں ہی مقام دیتا۔ لیکن وہ بے حد سازشی اور جرائم پیشہ انسان ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہوا۔ میں نے ضمانت کرائی۔ جوئے خانے چلاتا تھا چھاپہ پڑا۔ یہاں بھی میں کام آیا۔ کئی بار جیل جا چکا ہے۔ ایسے آدمی کو میں اپنے خاندان میں کس طرح برداشت کرتا۔"

"اوہ۔ آپ کو یقین ہے دادا جان؟" میں نے شدید حیرت سے پوچھا۔

"جو کچھ میں اس کے لئے کر چکا ہوں وہ تو میرے علم میں ہے۔"

"ان کے بیوی بچے؟"

"ایسے لوگ کہیں شادی کرتے ہیں ہارون۔" دادا جان بولے۔

"انہوں نے شادی کبھی نہیں کی۔"

"کبھی نہیں۔" دادا جان نے کہا اور اس کے بعد ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لئے دادا جان کے ساتھ رہا۔ لیکن ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا آنکھوں میں تاریکی چھا رہی تھی۔ واپس اپنے کمرے میں آیا اور دروازہ بند کرلیا۔

"افضال صاحب۔ افضال صاحب۔ افضال صاحب۔ افضال صاحب۔ جرائم پیشہ۔ شیراز۔ گریس ' میرا اغواء اور پھر تربیت۔ ہزاروں روپے کا خرچ۔ اور۔ اور فوزیہ۔ فوزیہ۔ فوزیہ۔ افضال صاحب کی بیٹی۔ ساری باتیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ فوزیہ اور افضال صاحب بھی فراڈ ہیں۔ لیکن کیوں۔؟"

"دادا جان سے اجازت لے کر چلا آیا اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر پڑا۔ دماغ دکھنے لگا تھا۔ سخت پریشان تھا میں۔ افضال صاحب بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہیں۔ ان کے ذہن میں بھی کوئی گڑبڑ ہے اور فوزیہ یہ لڑکی بھی جھوٹی ہے۔ اس کے انداز بھی مصنوعی ہیں۔

نہ جانے کتنی دیر تک کون کونسے حالات سے گزرتا رہا۔ افضال صاحب نے احسانات کئے تھے لیکن ان احسانات کے عوض وہ بھی مجھے جرائم کی زندگی کی طرف لا رہے تھے۔ میں جرم کی دنیا میں نہیں آنا چاہتا تھا اس طرح رمضان ہی کیا برا تھا۔ پھر کیا کروں۔

سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ دادا جان کو حقیقت سنادیں۔ لیکن اب تو معاملہ افضال صاحب کا بھی نہیں تھا دادا جان جنہیں ہارون کی زندگی کی خبر نے نئی زندگی بخش دی تھی' پھر زندہ درگور ہو جائیں گے۔ اور کسی زندہ درگور انسان کو اس بات سے کیا دلچسپی کہ اس کی دولت کون لوٹ رہا ہے۔ دادا جان کو یہ بات بتانا مناسب نہیں ہے۔

کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا دکھتے ہوئے ذہن سے سوچتا رہا۔ اور پھر افضال صاحب سے ہی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔



دوسرے دن پھر کار لے کر نکل آیا اور افضال صاحب کے گھر چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے مکان کے سامنے تھا۔ آج بھی فوزیہ نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔

"اوہ۔ آپ آیئے۔ آج تو میں تنہا ہوں۔" وہ مسرت سے بولی۔

"تنہا۔؟" "کیوں؟"

"افضال صاحب گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں۔"

"کب؟"

"صبح ہی صبح۔ شاید کل واپس آئیں گے۔" وہ میرے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اور ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

"اور کیسی ہو فوزیہ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں آپ سنایئے۔"

"میں کیا سناؤں۔ بس خادم ہوں تم لوگوں کا۔"

"کیا بات ہے۔ کیا انکساری کا کوئی کورس ہو رہا ہے۔" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں فوزیہ میں نے غلط تو نہیں کہا۔ ظاہر ہے میں تم لوگوں کا خادم ہوں' افضال صاحب نے اور تم نے میرے اوپر محنت کی ہے' ورنہ میں کیا تھا ایک غریب دیہاتی تمہیں تو میرے ماحول کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ تو ایک دیہاتی شخص کو تم نے زمین سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا' وہ تمہارا خادم نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔"

"جناب خادم صاحب آپ اب تو عرش پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوئے ہیں' اب تو ایسی باتیں نہ کریں۔"

"کیوں اپنی حیثیت بھول جاؤں فوزیہ؟"

"بھئی کیا فضول باتیں ہیں۔ کیا حیثیت ہے آپ کی' آپ یہ بات ماننے سے کیوں انکار کر رہے ہیں کہ آپ اس وقت لاہور کے بہت بڑے رئیسوں میں سے نہیں ہیں۔"

"اس لئے کہ میں نہیں ہوں فوزیہ۔"

"ہارون پلیز۔"

"نہیں فوزیہ کبھی کبھی تو مجھے میری اصلیت بخش دیا کرو۔ کبھی تو مجھے سردار علی کہہ دیا کرو۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اور فوزیہ تعجب خیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ہارون۔"

"کیوں آخر کیا ہوگیا' کیا کوئی خاص بات ہے' آج تم اس بات پر اصرار کیوں کر رہے ہو۔" فوزیہ نے سوال کیا۔

میں نے کہانا فوزیہ میں کرائے کا ہارون ہوں' اور اپنی اصلیت انسان کو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہوتی ہے جو لوگ وقتی حالات سے متاثر ہو کر اپنی اصلیت فراموش کر بیٹھتے ہیں وہ کبھی سکون نہیں پاتے!"

"تم بے سکون ہو سردار علی۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہاں فوزیہ!"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ جو ماحول مجھے دیا گیا ہے وہ میرے قابل نہیں ہے۔"

"اس کی وجہ؟"

"مسعود صاحب اتنے نیک دل اور پرمحبت انسان ہیں کہ انہیں دھوکہ دیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میرا بھی کوئی ہے فوزیہ اور میں انہیں چاہتا ہوں۔ میرے ماں باپ اور میری بہنیں میری حیات کا سرمایہ ہیں' جب کبھی میں یہ تصور کرتا ہوں کہ ان کی اولاد ان کے دیئے ہوئے نام سے بھی منسوب نہیں رہ سکتی تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے' یہ سارا ماحول یہ ساری زندگی جو مجھے عطا کی گئی ہے۔ بے شک بہت حسین بہت دلچسپ ہے لیکن اس میں میرے بہن بھائی شامل نہیں ہوسکتے۔ اس میں میرے ماں باپ شریک نہیں ہوسکتے۔"

"کیوں نہیں ہوسکتے سردار علی' ایک مستقل حیثیت اختیار کر جاؤ۔ ان چھوٹے چھوٹے ہنگاموں سے نمٹ لو تو پھر ان کے ساتھ رہنا۔ کون روکے گا تمہیں۔ مقصد تو صرف اس وقت کا ہے۔"

"فوزیہ خلوص دل سے یہ بات کہہ رہی ہو۔" میں نے سوال کیا اور فوزیہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی' اس کے چہرے پر ہلکے سے کرب کے آثار ابھرے آئے اور اس نے گردن جھکالی' نجانے میرے اس سوال نے اس کے ذہن کی کونسی دکھتی رگ پکڑ لی تھی۔

"جواب دو فوزیہ' کیا خلوص سے یہ سب کچھ کہہ رہی ہو۔"

"خلوص۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی' پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ہاں خلوص ہی کی بات کر رہا ہوں!"

"آج تمہیں کیا ہوگیا ہے ہارون۔"

"میں نے کہا ہارون نہیں سردار علی۔ صرف سردار علی۔"

"اوہ۔ تو تم ایک بار پھر ہارون سے سردار علی بن گئے ہو۔"

"ہاں فوزیہ۔ گھر سے نکلا تھا اپنی بہنوں کے لئے خوشیاں تلاش کرنے۔ ان کی شادی کرنے کے لئے دولت کمانے۔ کراچی پہنچا تو وہاں مصائب نے استقبال کیا اور نادانستگی میں ایک ایسی جگہ جا پھنسا جو جرائم پیشہ لوگوں کی تھی۔ ذہن اگر مجرمانہ کاروائیوں کو قبول کرتا تو رمضان کو نہ چھوڑتا' معمولی سی بات تھی فوزیہ' لیکن جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ شراب کشید کرتا ہے اور اسے فروخت کرتا ہے اور میں بھی اس کا آلۂ کار ہوں تو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کیا اور میں نے نفرت بھرے انداز میں رمضان کے بارے میں سوچا۔ فوزیہ میں جرائم کی دنیا کا انسان نہیں ہوں۔ بس ایک غریب دیہاتی معمولی سے کاموں میں ہی خوش رہ سکتا ہوں۔ تم نے مجھے جو کچھ بخشش دیا اس کا بہت بہت شکریہ لیکن میں اسے

مسلسل نہ چلا سکوں گا۔"

"کیا تمہیں بھی کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے سردار علی؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"مجھے ایک بات کا جواب دو گی فوزیہ؟"

"پوچھو۔"

"میں تمہارے سچ اور جھوٹ کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اتنے عرصے میں میری اور تمہاری ملاقاتوں میں کیا ابھی تک وہ ربط پیدا نہیں ہو سکا جو انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے۔ جو مصلحت کا ہر لباس اتار کر پھینک دیتا ہے۔ بتاؤ فوزیہ ہمارے درمیان یہ ربط کیوں نہیں پیدا ہو سکا۔"

"سردار علی تم.... تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"فوزیہ تم نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھ سے چاہت کا اظہار کیا یہ اظہار بھی اسی طرح مصنوعی ہے جس طرح میں ہارون ہوں۔" میں نے سوال کیا اور فوزیہ کی آنکھوں میں کرب نظر آنے لگا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی!

"مجھے صرف میری بات کا جواب دو فوزیہ!"

"مجھ پر یقین کرو گے سردار علی!"

"ہاں فوزیہ وعدہ کرتا ہوں' یقین کرلوں گا!"

"تو سردار علی میں تمہیں خلوص دل سے چاہنے لگی ہوں۔ میں اب تمہاری زندگی سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"ایک بات کا جواب اور دو فوزیہ!"

"پوچھو۔"

"کیا میں ساری زندگی ہارون رہوں گا؟"

"اس میں کوئی حرج ہے سردار علی۔"؟"

"تم خود جواب دو۔ میں اپنی پچھلی زندگی کس طرح فراموش کر سکتا ہوں۔ کیا یہ بات ممکن ہے۔؟" میں نے کہا۔

"ہاں ممکن ہے سردار علی' مجھے دیکھو میں بھی تو اسی کرب کا شکار ہوں۔ یہاں ہر شخص مصنوعی ہے سردار علی۔" یہاں ہر شخص نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنی ذات کو بھی فریب دیتا ہے' دنیا اسی ڈگر پر چل رہی ہے سردار علی۔ ہماری راہیں انوکھی نہیں ہیں۔"

"تم کس فریب کا شکار ہو ۔"

"سارے شیشے ایک دم توڑ دو گے سردار علی۔ کچھ تو رہنے دو۔ جذباتی ہو کر میں

صرف خود کو نہیں بلکہ دوسروں کو بھی کھو بیٹھوں گی۔"

"تم کس کرب کا شکار ہو فوزیہ؟" میں نے جنونی سے انداز میں پوچھا اور فوزیہ غور سے میری صورت دیکھنے لگی۔

"میں فوزیہ نہیں ہوں سردار علی۔ میں بھی اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہوں۔" فوزیہ گہری سانس لے کر بولی۔

"تم فوزیہ نہیں ہو!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں فوزیہ نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو تم۔"

"میں نجمہ ہوں! میں صرف نجمہ ہوں!"

"فوزیہ کیوں بن گئیں؟"

"حالات کے بھنور میں پھنس کر۔"

"کیا مطلب؟"

"اٹھو سردار علی۔ آج افضال صاحب گھر پر نہیں ہیں اس لئے ان ساری بندشوں کو چند لمحات کے لئے توڑ دیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔" وہ اٹھ گئی۔ میں بھی با دل نخواستہ اٹھ گیا تھا' وہ جس حالت میں تھی اسی طرح باہر نکل آئی اور کار میں آ بیٹھی۔" چلو۔"

"مکان یونہی چھوڑ دو گی فوزیہ؟"

"دنیا چھوڑ رہی ہوں۔ اس مکان کا کیا ہے۔" فوزیہ کرب سے بولی۔" خدا کے واسطے جلدی چلو۔ اور میں نے کار اسٹارٹ کردی۔ فوزیہ مجھے راستے بتاتی رہی' اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک شاندار ہسپتال پہنچ گئے فوزیہ کار سے اتر کر میرے ساتھ چل پڑی۔ اور پھر ہسپتال کے ایک خاص کمرے پر پہنچ کر وہ اندر داخل ہوگئی۔

"ایک بستر پر ایک بزرگ دراز تھے ان کے نزدیک پھل رکھے ہوئے تھے ایک نرس ان کی خدمت پر مامور تھی۔ اس نے مسکرا کر فوزیہ کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

"نجمہ بیٹی۔ آج خلاف توقع آگئیں؟"

"ہاں ابا میاں' سردار علی کو آپ سے ملانے لائی ہوں۔ سردار علی یہ میرے ابا میاں ہیں' یہ میرے والد ہیں' پانچ سال سے ٹی بی کے مرض کا شکار تھے۔ آخری اسٹیج پر پہنچ گئے تھے' لیکن افضال صاحب نے ہماری مدد کی آج میرے ابا میاں ٹھیک ہیں۔ اور بہت تھوڑے سے وقت کے بعد یہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ اب تندرست ہیں۔"

"ہاں بیٹے قدرت کے کھیل انوکھے ہوتے ہیں۔ یہ زندگی چھین لیتی ہے یہ زندگی بخش

دیتی ہے۔" بزرگ نے طویل سانس لے کر کہا۔

"آپ کب سے بیمار ہیں محترم؟" میں نے سوال کیا۔

"بیٹے تقریباً چھ سال سے' مزدور آدمی تھا' شدید محنت کرکے اپنے بچوں کے لئے بہتر زندگی حاصل کرنے کا خواہش مند۔ لیکن انسان کی خواہشات پوری کہاں ہوتی ہیں مجھے شدید محنت نے مجھ سے زندگی چھیننے کی کوشش کی اور ٹی بی کا شکار ہوگیا۔ اب تک جو کچھ بچایا تھا اس مرض پر ختم کر دیا لیکن وہ تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ سب کچھ لگانے کے بعد خیراتی اسپتال پہنچ کر زندگی کی آخری گھڑیوں کا انتظار کرنے لگا تب میری بچی عمل کی دنیا میں آئی اور جس کے لئے میں نے ایک شریفانہ ماحول اور اچھے گھر کے خواب دیکھے تھے وہ مصائب کے راستوں پر چل پڑی لیکن خدا نے اسے کچھ اچھے لوگ میسر کردیئے اور یوں میری زندگی کو ایک سہارا مل گیا اب ٹھیک ہوں اور ہسپتال سے نکلنے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ اپنی بچی کو محنت مزدوری کی زندگی سے نکال کر اس کا گھر دوں یہ میری دلی خواہش ہے۔"

"اوہ۔" میں نے ایک طویل سانس لی۔ فوزیہ میری نگاہوں کے سامنے آگئی تھی' گویا افضال صاحب اس کے والد نہیں تھے اور دادا جان نے جو بات کہی تھی وہ درست تھی یعنی یہ کہ افضال صاحب نے شادی بھی نہیں کی اور وہ جرائم پیشہ انسان ہیں۔ فوزیہ تھوڑی دیر رکی پھر باہر نکل آئی وہ خاموش تھی۔ "چلو" اس نے گاڑی میں بیٹھ کر کہا۔ اور میں نے کار پھر اسٹارٹ کردی۔

اس بار وہ مجھے راستے بتاتے ہوئے ایک معمولی سے رہائشی علاقے میں لے گئی تھی۔

یہاں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں اس نے میرا تعارف ایک بوڑھی عورت سے کرایا ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی اور تقریباً آٹھ نو سال کا لڑکا بھی وہاں موجود تھا۔" یہ میری ماں اور بہن بھائی ہیں اب سے پہلے ہم ایک بہت ہی بوسیدہ اور گندے سے مکان میں رہتے تھے جہاں زندگی کی کوئی سہولت موجود نہیں تھی' لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے بہن اور بھائی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں اور میری ماں سکون کی زندگی گزار رہی ہیں۔"

"چائے بناؤں بیٹے آپ کے لئے۔" بزرگ عورت نے پوچھا۔

"شکریہ۔ ضرور بنا دیجئے۔" میں نے جواب دیا۔ اور پھر میں نے فوزیہ کے ہاں چائے پی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا خیال ہے نجمہ چلیں۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بہت دیر ہو چکی ہے آؤ۔" اس نے جواب دیا اور ہم بزرگ عورت سے

اجازت لینے کے بعد کار میں آ بیٹھے.... تھوڑی دیر کے بعد میں اسی مکان میں تھا جہاں فوزیہ یا نجمہ رہتی تھی۔ وہ مجھے لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئی اور گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔

"تم میری اصلیت جان چکے ہو سردار علی اب جواب دو کہ انسان حالات کے ہاتھوں شکار ہو کر اپنی ذات نہیں کھو بیٹھتا؟"

"مگر فوزیہ اس سے آگے کے واقعات بھی تمہیں بتانا ہوں گے؟"

"ضرور' جب میں نے تمہیں اس حد تک بتا دیا ہے تو کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ تم نے مجھ سے ایک بات کہی تھی نا سردار علی۔"

"کیا؟"

"یہی کہ کیا میں تمہیں خلوص دل سے چاہتی ہوں۔ بس میرے پاس اتنا ہی ثبوت ہے' خدا کے واسطے اس سے زیادہ مجھ بے حیثیت لڑکی سے کوئی اور ثبوت مت طلب کرنا۔" اس نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک پڑے۔

"فوزیہ مجھے تمہارے اوپر مکمل اعتماد ہے۔"

"نہیں اس وقت تم نجمہ ہی کہو۔ میرا بھی حق بنتا ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا اور میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے اور اس کی دونوں آنکھیں چوم لیں' فوزیہ کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

"بتاؤ سردار علی۔ میری محبت پر یقین آیا یا نہیں؟"

"آگیا نجمہ' آگیا۔ اور خدا کی قسم بہت خوش ہوں۔"

"اگر میں تم سے محبت نہ کرتی سردار علی تو' تو یہ سب کچھ نہ بتاتی اس میں میرے والدین کی بقا چھپی ہوئی ہے' وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"میں جانتا ہوں نجمہ۔ لیکن براہ کرم اپنی حالت درست کرو۔ ابھی تو مجھے تم سے بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔" میں نے کہا۔

"پوچھو۔ آج سب کچھ پوچھ لو۔"

"افضال صاحب کون ہیں؟"

"ایک خطرناک آدمی۔ جس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی کام کرتے ہیں۔ مسعود صاحب کی دولت پر افضال صاحب کی پہلے سے نگاہ تھی' پھر ہارون ہوائی حادثے میں ہلاک ہوگئے تو افضال صاحب کے ذہن میں ایک اسکیم آئی۔ وہ کراچی چلے آئے میں بھی ساتھ ہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پلاسٹک سرجری کے کسی ماہر سے کسی جرائم پیشہ شخص کی صورت بدلوائی جائے اور اسے ہارون بنا کر پیش کر دیا جائے۔ لیکن اچانک تم نظر آگئے۔ تمہاری صورت ہارون سے اس قدر ملتی تھی کہ سب حیران رہ گئے کافی دنوں تک تو

افضال صاحب اسی خوف کا شکار رہے تھے کہ تم ہارون ہی تو نہیں ہو۔ اس بارے میں کافی معلومات حاصل کی گئیں۔ لیکن جب تمہارے والدین اور بہنیں سامنے آگئیں تب جا کر افضال کو سکون ہوا اور اس کے بعد وہ مطمئن ہو سکے۔"

"مجھے ہارون کیوں بنایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"افضال صاحب کا مطمع نظر بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔"

"یعنی؟"

"وہ تمہیں ہارون بنا کر۔ مسعود صاحب کی دولت ہتھیانا چاہتے ہیں۔ جب جائیداد تمہیں مل جائے گی تو افضال صاحب کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ انہوں نے مجھے مستقل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ان کا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ میری شادی کر دی جائے انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں آمادہ کرلوں۔ میں تمہیں اپنے جال میں پھانس لوں۔"

"ہوں' تمہارے جال میں تو پھنس گیا نجمہ۔"

"خدا کی قسم سردار علی میں بے قصور ہوں۔" نجمہ رو کر بولی۔

"پگلی اب یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ایک بات ضرور بتاؤ؟"

"پوچھو۔"

"کیا تم مجھے سردار علی کی حیثیت سے قبول کرلو گی۔"

"میں اعتراف کرتا ہوں نجمہ کہ میں بھی تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں' لیکن نجمہ' میں' میں مسعود صاحب کی دولت کے لئے سردار علی کو قتل نہیں کر سکتا۔ میں اپنی ذات میں زندہ رہوں گا۔

"سردار' تم واقعی سردار ہو۔ لیکن افضال بے حد خطرناک آدمی ہے' اگر اسے علم ہو گیا تو وہ؟"

"ہاں نجمہ' لیکن میں کوشش کروں گا۔ میں وہیں دادا جان کو سب کچھ بتادوں گا' اور اس کے بعد۔ اس کے بعد حالات جو رخ اختیار کرلیں۔"

"لیکن سردار علی۔ میرا خیال ہے یہ ابھی مناسب نہیں۔"

"کیوں؟"

"ہمیں اس کے لئے کسی منظم اسکیم کے تحت کام کرنا ہوگا۔ میں خود بھی ایسی دولت پر لعنت بھیجتی ہوں' لیکن افضال صاحب اور ان کے لوگوں سے نمٹنا خاصا مشکل مرحلہ ہو گا۔ میری ایک رائے ہے!"

"کیا؟"

"ابھی کچھ وقت مصلحت کے تحت گزار دو۔ اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہو۔"

"ہوں۔" میں نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی پھر بولا۔ ٹھیک ہے نجمہ۔ میں کچھ سوچوں گا کوئی لمبا کھیل ہی کھیلنا پڑے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔"

"اب مجھے اجازت دو نجمہ۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا

"پھر کب آؤ گے؟"

"جلدی نہیں آؤں گا۔ اور جب آؤں گا تو اس طرح کہ افضال صاحب کو شبہ بھی نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" نجمہ نے جواب دیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ لیکن ذہن تھا کہ بری طرح مچل رہا تھا۔ کوئی ترکیب بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دادا جان کو صورت حال بتاتا تو ان کی حالت پھر خراب ہو جاتی۔ کوئی اور بھی ایسا نہیں تھا کہ جو میرا ہمراز ہوتا۔

کوٹھی واپس آگیا۔ ماموں تصدق کی صاحبزادی بھی تشریف لا چکی تھیں میرا ان سے تعارف کرایا گیا۔ تیز و چالاک لڑکی معلوم ہوتی تھی' طاہرہ نے مجھے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا۔

"کیسے ہیں ہارون صاحب؟"

"جیسا ہوں آپ کے سامنے ہوں؟"

"آپ نے تو ہم سب کو رلا دیا تھا۔ خدا نے آپ کو نئی زندگی بخش دی' ہمیں بھی زندگی مل گئی۔"

"شکریہ!"

"آپ کے لئے کچھ اشعار کہے ہیں۔" وہ بولی۔

"اوہ۔ شاعر بھی ہیں آپ۔"؟

"جی ہاں' سحر تخلص کرتی ہوں' اور اس نام سے پکارے جانا پسند کرتی ہوں۔"

"یوں بھی آپ مجسم سحر ہیں' کیا پڑھتی ہیں!"

"کتاب زندگی' اسے جس رنگ میں دیکھ لو۔"

"خوب' باتیں بھی شاعرانہ کرتی ہیں۔"

"مزاج ہی شاعرانہ ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"وہ اشعار۔" سحر بولی۔

"پھر سہی۔ آپ کی شخصیت کا سحر اتنا گہرا اثر ہے کہ دوسری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"طبیعت تو آپ کی بھی شاعرانہ ہے۔ کیا آپ بھی شاعری کرتے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"خوب کیا تخلص کرتے ہی؟"

"ساحر۔"

"واہ۔" سحر ہنس پڑی۔ "بڑا لطیف اشارہ کیا ہے آپ نے میں ذہن میں رکھوں گی۔" اس نے کہا اور اس وقت دادا جان کے پاس سے بلاوا آگیا۔

"افسوس۔ ہمارے درمیان زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی.... پھر سہی۔ دوبارہ اپنے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا!" میں نے کہا اور دادا جان کے کمرے کی طرف چل پڑا'



مسعود صاحب کے کمرے میں ایک صحت مند اور پر رعب شخص بیٹھا تھا' اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ بہت گہرے ذہن کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ گیا۔

"ہیلو' ہارون صاحب!"

"ہارون بیٹے۔ یہ جہانگیر ہیں۔ آج ہی بات ہوئی تھی...." دادا جان نے کہا اور میں نے مسکراتے ہوئے جہانگیر سے ہاتھ ملایا۔

"نئی زندگی پر میری طرف سے مبارکباد قبول کریں ہارون صاحب۔"

"شکریہ۔"

"مسعود صاحب نے مجھے پوری تفصیل بتا دی ہے۔ بے شک اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ آپ جائداد کا نظام اپنے ہاتھ میں سنبھال لیں۔"

"جی۔ میں نے مختصراً کہا۔

"مسعود صاحب کی ہدایت پر میں نے کاغذات کی تیاری زوروشور سے شروع کردی ہے۔ چند کاغذات پر آپ کے دستخطوں کی ضرورت ہے۔ جہانگیر صاحب نے اپنا بریف کیس کھولا اور چند کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ پھرانہوں نے اپنا قلم نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ان جگہوں کی نشاندہی کی۔ جہاں مجھے دستخط کرنے تھے' میں نے اطمینان سے ہارون کے دستخط کردیئے ان دستخطوں کی مجھے کافی مشق کرائی گئی تھی۔ جہانگیر صاحب نے انتہائی غور سے ان دستخطوں کو دیکھا۔ کاغذات تہہ کرکے فائل میں رکھے اور فائل واپس بریف کیس میں رکھ دی۔

"اور ہارون میاں ذہنی کیفیت کیسی ہے۔؟"

"ٹھیک ہوں جہانگیر صاحب' کوئی خاص بات نہیں ہے' اپنوں میں آنے کے بعد انسان ہر قسم کی تکالیف سے دور ہو جاتا ہے!"

"بے شک بے شک' ویسے یورپ میں آپ نے خاصی عمدہ زندگی گزاری ہوگی۔"

"جی ہاں جو وقت بھی گزارا بہتر تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہاں آئے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے ہارون صاحب چنانچہ اب میں اجازت چاہتا ہوں' کل صبح آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔"

"جی۔"

"جی ہاں' میرے دفتر تشریف لے آیئے' کچھ ضروری امور پر گفتگو کرنی ہے اور کچھ مزید کاغذات کی تیاری میں بھی آپ سے مدد درکار ہوگی!"

"بہتر ہے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن مجھے آپ کا دفتر نہیں معلوم۔!

"میں اپنا آدمی بھیج دوں گا آپ کے پاس وہ آپ کو ساتھ لے آئے گا۔"

"جی بہتر۔" میں نے جواب دیا اور جہانگیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہتر ہے مسعود صاحب اب مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی حسب منشاء تمام کاغذات تیار کر لئے گئے ہیں کل جائداد اور تمام امور مسٹر ہارون کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے اور اس کے بعد مسٹر ہارون جیسے بھی پسند کریں۔"

"میں تو چاہتا ہوں جہانگیر کہ تم مسلسل ان کی مدد کرتے رہو۔ تمہارے بہتر مشورے ان کے لئے کارآمد ہوں گے۔"

"بہتر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے ہارون میاں بھی سے ان جھنجٹوں میں نہ پھنستے تو بہتر تھا۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔

"نہیں جہانگیر میاں حالات جو کچھ بھی ہیں تمہارے علم میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہارون مکمل طور پر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔"

"جی بہتر ہے میں ان کی ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔" جہانگیر نے کہا اور پھر وہ مجھ سے اور مسعود صاحب سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا' مسعود صاحب مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"بیٹے میں نے تمہاری خواہش کے مطابق سب کچھ کر دیا ہے کل کا دن میری زندگی میں بڑی خوشی کا دن ہے۔ میں تو اپنی زندگی میں اس حسین دن سے مایوس ہی ہو گیا تھا لیکن خدا کا احسان ہے کہ اس نے مجھے یہ سب کچھ پھر لوٹا دیا' کل کے بعد میں ایک جشن کا انتظام کروں گا اور تم اس میں میری مدد کرنا۔"

"بہتر ہے دادا جان۔"

"ویسے ان لوگوں کے بارے میں تم نے مزید کچھ سوچا بیٹے۔؟"

"کن لوگوں کے بارے میں؟"

"جو ہماری ذات سے منسلک ہیں!"

"دادا جان میری خواہش ہے کہ ان میں سے کسی کو میری ذات سے تکلیف نہ پہنچے' البتہ جائیداد وغیرہ کو یہ لوگ جو نقصان پہنچا رہے ہیں اسے سنبھالنا تو میرا فرض ہے۔"

"بے شک بے شک۔ کیوں نہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ ہم نے بڑی مشکل سے اکٹھا کیا ہے۔ اس کی حفاظت اور نگرانی کرنا بھی ہمارا ہی فرض ہے!"

"جی دادا جان!"

"بہر صورت میں نے تمہیں مکمل آزادی دے دی ہے۔ اور کل ان کاغذات کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی میں تمہارے مطلق العنان ہونے کا اعلان کردوں گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک میں دادا جان کے ساتھ بیٹھا

رہا پھر اٹھ آیا۔ اس وقت میں سب سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خاموشی سے ایسے راستے اختیار کئے جہاں کسی کے نہ ملنے کا امکان ہو اور اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرہ بند کر کے میں لیٹ گیا' ذہنی حالت ابتر ترین ہوتی جا رہی تھی' جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ بہت ہی خطرناک تھا' افضال صاحب کے مذموم ارادے کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ لیکن میں ان کے لئے دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔ میں ان شریف لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنا الو سیدھا کرنا پسند نہیں کرتا' میری تو فطرت ہی دوسری ہے۔ چنانچہ کیا کیا جائے.... میں تنہا انسان۔ افضال صاحب جیسے شخص سے نمٹنا بے حد مشکل کام تھا۔ لیکن تھوڑی سی تگ و دو کے بعد روشنی کی چند لکیریں میرے ذہن میں رینگ آئیں۔ میری نگاہوں میں ایک زیرک چہرہ ابھر آیا تھا' اور وہ چہرہ جہانگیر صاحب کا تھا۔

یہ شخص اپنی کشادہ پیشانی اور صحت مند جسامت کی وجہ سے خاصا ذہین اور باوقار معلوم ہوتا تھا۔ اگر یہ شخص میری مدد پر آمادہ ہو جائے تو میرا خیال ہے میں بہت سے مسائل سے نمٹ سکتا ہوں۔ ہاں یہی بہتر ہے۔ میں نے سوچا۔ دادا جان کو بتانے کی بجائے جہانگیر صاحب کو بتانا زیادہ ضروری ہے بلکہ یہ سب سے زیادہ مناسب بات ہے کیونکہ دادا جان نے ان پر مکمل اعتماد کا اظہار بھی کیا ہے۔

"میں ایک دم خوش ہوگیا' مجھے ایک ایسا سہارا مل گیا تھا جس کا میں متلاشی تھا اور اس سہارے کے مل جانے کے بعد مجھے ایک قسم کا سکون سا محسوس ہو رہا تھا' چنانچہ اس فیصلے پر اٹل ہونے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ اب میں خاصا خوش و خرم تھا۔ تھوڑی دیر تک شازیہ سے گفتگو ہوتی رہی' وہ اپنا وہی پرانا راگ گا رہی تھی۔ یعنی یہ کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن اب اس سے اجتناب برت رہا ہوں۔ ابھی شازیہ کو مطمئن کر ہی رہا تھا کہ سحر صاحبہ آگئیں اور آتے ہی انہوں نے ایک شعر پڑھ دیا۔

"یہ کس کا شعر ہے۔" شازیہ نے ایک دم پوچھ لیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کی شاعرہ کوئی سحر صاحبہ ہیں۔"

"جی ہاں اور وہ یہی خادمہ ہے۔" سحر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"واہ تم نادرہ سے سحر کب بن گئیں۔"؟"

"آپ کو ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ بچوں سے ذرا دور کی باتیں ہیں۔" سحر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں میں کبھی بزرگوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔ آیئے ہارون صاحب کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"کیا بدتمیزی ہے شازیہ۔" سحر نے ناگوار انداز میں کہا

"جی۔ مجھے تعجب ہے نادرہ آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ مجھ سے اس لہجے میں بات کریں۔" شازیہ بپھر کر بولی۔

"میں کہتی ہوں فضول باتوں سے دریغ کرو' بڑوں کا احترام کرنا سیکھو۔"

"میں بھی یہی عرض کر رہی ہوں اور احتراماً ہی یہاں سے اٹھ کر جا رہی ہوں۔"

"ہارون صاحب آپ کھڑے کیوں ہیں؟"

"یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کے درمیان کوئی فیصلہ ہو جائے تو چلوں یا میرا خیال ہے آپ لوگ ایسا کریں۔ ٹھہریئے۔" میں نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا وہ دونوں خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے باہر نکل کر تیزی سے راہداری میں آگیا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ طاہرہ مل گئی میں اسے دیکھ کر مسکرایا اور میں نے اسے باغ کے گوشے میں آنے کا اشارہ کیا۔ طاہرہ اطمینان سے میرے ساتھ آگئی اور ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ "خیریت۔ بڑے مسرور نظر آ رہے ہیں۔"

"شازیہ اور نادرہ آپس میں لڑ رہی ہیں۔"

"کیوں؟"

"بس جھگڑا وہی ہے۔ یعنی ہارون۔"

"اوہ تو گویا جائیداد پر جھگڑ رہی ہیں۔ ٹھیک ہے یہ جھگڑا نیا نہیں ہے۔ تاریخ بھری پڑی ہے۔ طاہرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کے والدین کا کیا حال ہے؟"

"مجھے دنیا کی سب سے حسین اور سب سے ذہین لڑکی تسلیم کر لیا گیا' مشورے دیئے جا رہے ہیں کہ شادی کے بعد کیا کیا کرنا ہوگا!"

"آپ خاموش رہیں۔"

"صرف اس لئے کہ انہوں نے شوہر کے طور پر آپ کا نام نہیں لیا تھا۔ اور پھر ابھی مناسب وقت بھی نہیں ہے کسی مناسب وقت اور آپ کے مشورے کے ساتھ اس بات کا اعلان کرنا مناسب ہوگا۔"

"ٹھیک ہے طاہرہ۔" میں نے جواب دیا اور پھر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح دس بجے جہانگیر صاحب کا آدمی آگیا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا' جہانگیر صاحب نے شاندار آفس میں میرا استقبال کیا تھا انہوں نے مجھے بیٹھنے کی پیش کش کی

اور پوچھا کہ میں کیا پیوں گا!

"ابھی ناشتہ کیا تھا جہانگیر صاحب کسی شے کی حاجت نہیں ہے۔"

"تب پھر کام کی گفتگو شروع ہو جائے۔"

"جی ہاں یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے جہانگیر صاحب کے کمرے میں بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میری پی اے ہے۔ کیوں؟" جہانگیر صاحب نے پوچھا۔

"میں مکمل تنہائی چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔ بہتر ہے۔ جہانگیر نے کہا اور لڑکی کو باہر بھیج دیا پھر وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ "آپ کا کیا خیال ہے ہارون صاحب جائیداد اور کاروبار کے نگراں حضرات کاروبار میں گڑبڑ کر رہے ہیں۔"!

"جہانگیر صاحب۔ ایک دفعہ گفتگو کے دوران دادا جان نے کہا تھا کہ آپ ان کے خاندان کے سب سے بڑے بہی خواہ ہیں کیا یہ درست ہے۔"

"عجیب سوال ہے ہارون صاحب۔ میں اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں طویل عرصہ سے اس خاندان کا نمک خوار ہوں۔ اور اگر انسان کے خون میں ذرا بھی شرافت ہو تو اسے نمک خوار ہونا چاہئے۔"

"اگر یہ خاندان کسی طور تباہی کا شکار ہونے والا ہو تو آپ کو دکھ تو ہوگا!"؟

"کیوں نہیں!"

"میں اس خطرے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" جہانگیر صاحب تعجب سے بولے۔

"جی ہاں جہانگیر صاحب۔ میں ہارون نہیں ہوں۔"

"کیا؟" جہانگیر صاحب سنسنی خیز لہجے میں بولے۔

"جی ہاں میرا نام سردار علی ہے' ایک دیہات کا باشندہ ہوں کراچی میں تھا کہ چند لوگوں کے جال میں پھنس گیا اور انہوں نے مجھے ہارون بنا دیا۔ مجھے پوری کتاب سنائی گئی اور پھر طویل عرصہ تک مجھے ہارون ہونے کی تربیت دی گئی ان لوگوں نے میرے اوپر احسانات کئے ہیں اور میں ان کا ممنون ہوگیا۔ بالآخر وہ مجھے یہاں لے آئے۔ اور ہارون کی حیثیت سے دادا جان کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن مجھ سے کچھ اور کہا گیا تھا جہانگیر صاحب مجھے اس وقت حقیقت حال کا علم نہیں تھا۔"

"جی ہاں' مجھے کسی نے شناخت نہیں کیا۔"

"لیکن سردار صاحب۔ آپ اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ یہ تو ایک حسین مستقبل کا سوال ہے آپ کی پشتیں عیش کریں گی۔" جہانگیر صاحب بولے۔

"دادا جان نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے اک بات کہی تھی وہ یہ کہ آپ اس خاندان کے بہی خواہ ہیں' ان الفاظ کی روشنی میں میں یہاں تک آیا ہوں جہانگیر صاحب۔ میں تنہا انسان ہوں میں اکیلا ان لوگوں سے نہیں نمٹ سکتا۔ خدا کے لئے آپ مجھے ایسا مشورہ نہ دیں۔"

"لیکن سردار علی صاحب۔ اس میں حرج کیا ہے۔"؟

"حرج۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "حرج تو بہت ہے جہانگیر صاحب۔ میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔ شاید میری رگوں میں فرسودہ خون ہے۔ جذبہ ہمدردی تو مجھے اس کے لئے مجبور کر سکتا ہے لیکن میں ان لوگوں کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ جو مسعود صاحب کی دولت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔"

"اوہ۔ لیکن آپ نے مسعود صاحب سے بات کیوں نہیں کی؟"

"میں ان کے ارمانوں کا خون نہیں کر سکتا' ہارون کی زندگی سے انہیں جو خوشی ہوئی ہے میں اسے نہیں چھین سکتا۔ میری ہمت نہیں پڑتی۔" میں نے جواب دیا۔

"تعجب ہے سردار علی صاحب' سخت تعجب کی بات ہے۔ آپ کروڑوں روپے کی جائیداد اور دولت کو ٹھکرا رہے ہیں۔ صرف اپنے ضمیر کی خاطر۔"

"اگر مجھے ان لوگوں کی نیت معلوم ہو جاتی تو شاید ابتداء ہی سے میں تیار نہ ہوتا۔ لیکن سب کچھ آہستہ آہستہ معلوم ہوا۔"

"اچھا یہ بتائیے آپ نے دادا جان سے یہ بات کیوں کہی تھی کہ جائیداد وغیرہ آپ کو سونپ دی جائے؟"

"مجھے اس کی ہدایت ملی تھی۔"

"اب آپ ان لوگوں کی نشاندہی کریں جنہوں نے آپ کو آلۂ کار بنایا۔"

"کیا کہا گیا تھا آپ سے سردار علی صاحب؟"

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کی امداد کا سوال ہے جو اس صدمے کی وجہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور میں صرف اس جذبے کی بنیاد پر تیار ہو گیا تھا"

"تعجب ہے سخت حیرت ہے کوئی بھی تمیز نہیں کر سکتا کہ آپ ہارون نہیں ہیں۔"

"افضال صاحب' ان کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اور جہانگیر صاحب کچھ دیر تک ساکت و جامد رہے۔ پھر انہوں نے اپنی پشت پر موجود ایک دروازے کی طرف رخ کر کے کہا۔

"آ جائیے جناب' یہاں تو سچویشن ہی بدل گئی ہے۔" اور پشت کا دروازہ کھول کر ایک نوجوان شخص اندر داخل ہوگیا۔ مخمل کے کوٹ میں ملبوس بے حد اسمارٹ نوجوان تھا' لیکن اس کی شکل دیکھ کر مجھے چکر آگئے وہ سو فیصد میرا ہم شکل تھا ایسی انوکھی مشابہت تھی کہ میں دنگ رہ گیا تھا۔



"خادم کو ہارون کہتے ہیں۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور میں مسرت سے اچھل پڑا۔

"ہارون صاحب۔ آپ۔ آپ زندہ ہیں؟"

"بفضل خدا۔ لیکن بڑی شرمندگی ہوئی ہے اس وقت سردار صاحب!"

"کیوں؟" جہانگیر صاحب نے پوچھا۔

"بھئی ہم نے تو بڑے پروگرام بنائے تھے ان سے نمٹنے کے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ میرا ہم شکل میری ہی مانند حسین دل کا مالک ہے۔" ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں

ابھی تک پریشان و سراسیمہ بیٹھا ہکا بکا ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں دوست میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔ جہاز کا حادثہ واقعی ہوا تھا لیکن اتفاق سے میں اس جہاز میں سفر نہیں کر سکا تھا' میری کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اور پھر طویل عرصہ تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد میں خاموشی سے واپس آگیا' کوٹھی پہنچا تو تمہیں دیکھا اور میں خاموشی سے وہاں سے واپس چلا آیا۔ پھر میرے ایک خاص آدمی نے کوٹھی کے حالات مجھے بتائے اور کہا کہ میں تو یہاں موجود ہوں' چنانچہ میں سیدھا جہانگیر صاحب کے پاس پہنچ گیا اور جہانگیر صاحب نے اس سلسلہ میں کام شروع کردیا۔ ہم دونوں حیران تھے کہ آخر تم کون ہو' ہمارا خیال تھا کہ تم نے اپنے چہرے پر کوئی نفیس میک اپ کر لیا ہے' بہرحال ہم حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ تمہارے اوپر بھرپور ہاتھ ڈالیں' ہمیں یقین تھا کہ تم بالکل تنہا نہیں ہو تمہاری پشت پر کوئی اور ہے۔ بلکہ ایک بار تو جہانگیر صاحب نے افضال صاحب کا نام بھی لیا تھا یہ جہانگیر ہی نہیں جہاندیدہ بھی ہیں۔" ہارون مسکرا کر بولا۔

"میں اب بھی ششدر تھا۔ لیکن میرے ذہن سے بوجھ ضرور اتر گیا تھا۔ اب اگر افضال صاحب روشنی میں بھی آ جائیں تو دادا میاں کی جان کا خطرہ نہیں ہے۔"

"آپ کیا سوچنے لگے جناب؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں بے اختیار بول اٹھا۔

"کیا خطرہ؟"

"دادا میاں کے لئے۔ میرا مطلب ہے اب میں خود ہی انہیں تفصیل بتا دوں گا۔ میں بھی سولی پر لٹک رہا تھا۔ جب سے مجھے نجمہ نے تفصیل بتائی میں سخت پریشان تھا میں سوچتا تھا کہ افضال صاحب کو کبھی کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ بس خطرہ تھا تو صرف دادا جان کا۔ اصلیت معلوم ہونے کے بعد وہ پھر اس غم کا شکار ہو جائیں کہ ہارون مر چکے ہیں۔"

"تم نیک انسان ہو سردار علی۔ بلکہ اب تو ہم اس لئے تمہارے شکرگزار ہوگئے ہیں کہ جن مراحل سے مجھے گزرنا پڑتا۔ انہیں تم نے ختم کر دیا۔" ہارون بولا۔

"تو پھر آپ دادا جان سے مل لیں۔"

"اوہ نہیں سردار علی۔ کیا افضال صاحب کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔" جہانگیر نے کہا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم اب وہ کرو جو ہم کہیں۔ ذرا سی تفریح بھی رہنی چاہئے۔ ویسے یہ فوزیہ یا نجمہ صاحبہ بذات خود کیا چیز ہیں۔"

"ایک مظلوم لڑکی جسے افضال صاحب نے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔" میں نے مختصراً

نجمہ کے بارے میں تفصیل بتادی۔"

"اوہ۔ تب تو اسے بھی سہارا ملنا چاہئے۔ کیا یہ ممکن نہیں سردار علی کہ آپ اسے اپنالیں؟" ہارون نے کہا اور میں پریشان ہوگیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے ہارون صاحب؟"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک شریف لڑکی ہے۔"

"لیکن میں۔ میری حالت۔؟"

"آپ ایک کام کریں سردار علی صاحب۔ اب تک آپ کی شرافت افضال صاحب پر خرچ ہوتی رہی اب اسے ہمیں سونپ دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب جیسا ہم کہیں کرتے رہیں۔ ہم بھی آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ دیکھیں آپ نے اب تک اس خاندان کی بہتری کے لئے سوچا ہے ایک بار اور سہی میرے لئے اور پھر یوں بھی آپ پر میرا تو حق بھی ہے آپ میرے ہم شکل ہیں۔ بولئے ہم سے تعاون کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، ہارون صاحب۔" میں نے گردن جھکادی۔ اور دونوں خوش ہوگئے۔ پھر وہ کئی گھنٹے تک مجھ سے بحث کرتے رہے۔ بہت سے مسئلے حل ہوئے تھے اور انہوں نے بالآخر مجھے چند اہم اقدامات کے لئے مجبور کر دیا اور میں تیار ہوگیا۔

"پھر چند ضروری کاغذات جہانگیر صاحب نے میرے حوالے کردیئے اور اس کے بعد مجھے اجازت مل گئی میں وہاں سے اٹھ گیا' لیکن اب مجھے کافی اطمینان تھا' کم از کم یہ احساس ذہن سے مٹ گیا تھا کہ میں کسی مجرمانہ کاروائی میں حصہ لے رہا ہوں۔

"واپس کوٹھی پہنچا تو دادا جان منتظر تھے۔ مجھ سے تفصیلات پوچھیں اور میں نے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیئے۔ "خوب۔ یہ کام ہوگیا' آج رات کو میں ان لوگوں میں اعلان کر دوں گا۔"

"بہتر ہے دادا جان۔" میں نے جواب دیا اور پھر رات کے کھانے کے طویل میز پر جبکہ سب موجود تھے' دادا جان نے کہا۔

"میرا خیال ہے، کھانا کھانے سے قبل میں آپ سب لوگوں کو ایک اہم اطلاع دے دوں۔ کیا آپ لوگ مجھے اس کی اجازت دیں گے۔؟"

"ضرور چچا جان۔ کیا حکم ہے۔" ماموں تصدق بولے۔

"خدائے عزوجل کے فضل سے ہارون میاں زندہ سلامت ہمارے درمیان واپس آ گئے۔ یہ دولت جائیداد بلا شرکت غیرے ان کی ہے میں آج اپنے کاندھوں پر سے یہ بوجھ

اتار رہا ہوں اور سب کچھ ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ جہانگیر نے ساری کاروائی مکمل کرلی ہے۔ اور اب ہارون بلا شرکت غیرے اس ساری جائیداد کے مالک ہیں۔"

"خدا مبارک کرے۔ خدا عمر دراز کرے۔" آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن ان کے کھوکھلے پن کا بخوبی احساس ہوتا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ سب لوگ ہارون سے تعاون کریں گے جو لوگ جائیداد وغیرہ کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں وہ فوری طور پر تمام حسابات اور تفصیلات ہارون کو پیش کردیں۔" دادا جان نے کہا اور گویا لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

"پھر تصدق ماموں نے ہی جرات کی۔ "لیکن چچا جان جو لوگ یہ انتظامات سنبھالے ہوئے ہیں۔ سب اپنے ہی ہیں کیا اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔"؟"

"ہاں۔ ہارون ازسرنو اس سلسلہ میں کاروائی کریں گے۔ انہیں پائی پائی کا حساب دیا جائے۔" دادا جان کی آواز ٹھوس تھی اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر کھانا شروع ہوگیا۔ لیکن اس رات سب نے بددلی سے کھانا کھایا تھا۔ صرف طاہرہ تھی جو لمبے لمبے ہاتھ مار رہی تھی۔

"پروگرام کے دوسرے دور کا آغاز دوسری صبح کر دیا گیا میں نے دادا جان سے بات کی تھی۔ "دادا جان۔ میں افضال صاحب کو بھی یہیں لانا چاہتا تھا۔

"افضال کو۔ کیوں بیٹے؟" دادا جان نے تعجب سے پوچھا۔

"بس یہ میری خواہش ہے۔ براہ کرم اجازت دے دیں۔"

"تم بچے نہیں ہو ہارون میاں۔ اپنا بھلا برا خوب سمجھتے ہو۔ اگر تم بہتر سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" دادا جان نے کہا۔

"آپ مطمئن رہیں دادا جان۔ کوئی ایسی بات نہیں ہونے پائے گی۔ میں ان کے سپرد اہم ذمہ داریاں کروں گا جرائم کی تلاش کے لئے ایک مجرمانہ ذہن بہت موزوں ہوگا۔ لیکن میں انہیں بھی ایک حد میں رکھوں گا۔ بس آپ میرا کھیل دیکھتے رہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جو مناسب سمجھو کرو۔" دادا جان میرے ساتھ ہمیشہ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور پھر میں دن کو گیارہ بجے کے قریب افضال صاحب کی طرف روانہ ہوگیا۔

"افضال صاحب موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر کھل اٹھے بڑے تپاک سے بٹھایا۔ "مجھے علم ہوا تھا کہ تم آئے تھے۔ بس میں بھی بعض اوقات مصروف ہو جاتا ہوں۔ اور سناؤ کیسے حالات چل رہے ہیں؟"

"میں تو خادم ہوں افضال صاحب۔ آپ کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کر رہا ہوں

یہ ان کاغذات کی نقول ہیں جن کے تحت دادا جان نے سارے اختیارات مجھے سونپ دیئے ہیں۔" میں نے ایک فائل افضال صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

"افضال صاحب فرط مسرت سے اچھل پڑے تھے۔ وہ کاغذات دیکھتے رہے اور پھر انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ "واہ میرے شیر۔ تم نے تو سب کو چت کر دیا۔ خدا کی قسم اتنی زبردست کامیابی کی مجھے امید نہیں تھی۔"

"شکریہ۔ اب کیا حکم ہے؟" میں نے کہا۔

"بس اب ان کے حلق میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک پائی اگلوا لو ان سے۔ واہ کیا کام ہے۔ کاش میں براہ راست ان سب سے نمٹ سکتا۔" افضال صاحب ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کب چل رہے ہیں آپ کوٹھی؟" میں نے پوچھا۔

"کہاں۔ مسعود صاحب کے ہاں۔؟" افضال صاحب بولے۔

"جی ہاں!"

"اوہ۔ نہیں ہارون بیٹے۔ میرا وہاں جانا ممکن نہیں ہے۔ مسعود صاحب بھی مجھے پسند نہیں کرتے اور دوسرے لوگ تو میرے نام سے جلتے ہیں۔"

"لیکن اب وہ کوٹھی میری ملکیت ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔ مسعود صاحب کو رام کرنے کی کوشش کرو۔ وہ اگر اجازت دے دیں تو پھر میں وہاں آؤں۔"

"یہ کام میں کرچکا ہوں افضال صاحب۔" میں نے کہا اور افضال صاحب ایک بار پھر اچھل پڑے۔

"کیا۔ کیا مطلب؟"

"دادا جان سے اجازت لے لی گئی ہے سامان باندھیئے۔" میں نے کہا۔

"ارے کب؟ کیسے؟ کیسے آخر۔" انہوں نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا اور میں نے مختصر سی تفصیل بتادی۔ افضال صاحب خوشی سے دیوانے ہوگئے تھے۔ "کمال ہے۔ بس کمال ہے۔ اوہ۔ تو تم بہت عظیم نکلے ہارون۔ تم تو۔"

"تیاریاں کرلیں۔ ہم چل رہے ہیں۔"

"ابھی نہیں شام کو آؤں گا۔ اور پہلے ایک مہمان کی حیثیت سے آؤں گا' ذرا یہاں کا جائزہ لے لوں۔ تم شام کو پانچ بجے چائے پر میرا انتظار کرنا اور ہاں ذرا سا اہتمام بھی ہو جائے۔"

"بہتر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"فوزیہ بھی آئے گی میرے ساتھ۔" افضال صاحب بولے۔

"ضرور۔ ظاہر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر دیر تک میں ان کے ساتھ رہا۔ جہانگیر علی ایڈووکیٹ کا ذکر بھی آیا لیکن اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ افضال صاحب کے خیال کے مطابق میں اب خطرات سے نکل گیا تھا۔ پھر میں چلا آیا۔

شام کو لان پر چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مسعود صاحب بھی موجود تھے اور ان سب لوگوں کی موجودگی میں افضال صاحب فوزیہ کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ فوزیہ سادہ سے لباس میں بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ لوگوں نے انہیں دیکھا اور بل کھا کر رہ گئے۔"

خدا خیر کرے۔ یہ کہاں سے نازل ہوگیا۔" پھوپی زلیخا بولیں۔

"یہ کیا لغویت ہے۔ یہ لڑکی کون ہے اس کے ساتھ؟" ناہید بیگم بولیں۔

"میرے مہمان ہیں ان کا احترام کیا جائے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور سب کے منہ کھلے رہ گئے' افضال صاحب نے سب سے پہلے مسعود صاحب کو سلام کیا تھا۔ مسعود صاحب ذہنی طور پر تیار تھے اس کے بعد دوسرے لوگوں نے رسمی سی ملاقات کی۔ لیکن کسی نے تپاک کا اظہار نہیں کیا تھا' البتہ میں بڑے خلوص سے پیش آیا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے افضال صاحب؟" مسعود صاحب بولے۔

"میری بچی ہے۔"

"لیکن تم نے شادی کب کی؟"

"آپ لوگوں کی شفقت سے محروم ہو کر زندگی میں کوئی سہارا تو تلاش کرنا ہی تھا۔ لیکن افسوس وہ سہارا بھی میرا ساتھ نہ دے سکا۔"

"جیتی رہے پیاری بچی ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"آج ہارون میاں نے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا ہے۔ انہوں نے تو بڑی ذمہ داریاں رکھ دی ہیں میرے کاندھوں پر۔ بہرحال ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں گا۔"

"کیا ذمہ داریاں سونپی گئیں ہیں تمہیں افضال صاحب؟" ماموں تصدق نے طنزیہ پوچھا۔

"جائیداد ملوں اور دوسرے کاروبار کا حساب کتاب آپ لوگوں سے لینے کی ذمہ داریاں۔" افضال صاحب نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ چچا جان۔ کیا اب ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا!" ماموں تصدق بری طرح بگڑ گئے۔

"یہ معاملات اب ہارون میاں کے ہیں۔ میں ہر معاملے میں مداخلت چھوڑ چکا ہوں۔"

"لیکن یہ ہماری توہین ہے۔" اجمل صاحب بولے۔

"میں ذاتی معاملات میں داخلت پسند نہیں کروں گا۔ افضال صاحب اب یہیں قیام کریں گے۔"

"تب پھر ہارون میاں ہم یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ ہمیں اپنی عزت عزیز ہے۔

"آپ ضرور یہاں سے چلے جائیں لیکن حسابات دینے کے بعد۔ اس کے لئے آپ قانونی طور پر پابند ہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور کھلبلی مچ گئی۔ بری حالت ہوگئی تھی ان لوگوں کی اور افضال صاحب فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔



"دادا جان کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ دوسرے ہی دن افضال صاحب معہ ساز و سامان کے آگئے ان کے لئے ایک بہترین حصہ خالی کرالیا گیا تمام لوگوں کی بری حالت تھی لیکن مجبور تھے۔ افضال صاحب نے دوسرے ہی دن ہدایات جاری کردیں۔ کراچی بھی تار دے دیا گیا تھا۔ بہرحال کوٹھی کی فضا کافی دلچسپ ہوگئی۔ ہر چہرہ اترا ہوا تھا۔ سب کے منہ پر ہوائیں اڑ رہی تھیں۔ حویلی میں رات گئے تک نشستیں جاری رہیں۔ تمام حسابات طلب کر لئے گئے تھے اور ان میں کافی گڑ بڑ نکل رہی تھی' یہ گڑبڑ دادا جان کے علم میں

بھی آ رہی تھی لیکن کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دادا جان سب کو لعنت ملامت بھی کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے ہر طرح سے تم سب لوگوں کو خیال رکھا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لوگ اپنا گھر بنا رہے ہو۔ دادا جان نے نوٹس دے دیا کہ سارے حسابات بالکل درست کئے جائیں ورنہ وہ قانونی چارہ جوئی کریں گے اور پھر میرے پاس روز آنے لگے ماموں تصدق، خالو جمال اور پھوپھا وغیرہ' یہ سب میرے پاس رحم کی درخواستیں لے کر آئے تھے ان سب نے مجھے اپنی اولادوں کے حوالے دیئے۔ اور کہا کہ آخر میں ان کا خون ہوں۔ وہ یہ سب کچھ ادا نہیں کر سکتے۔"

"بہرحال میں نے ان میں سے چند کو مراعات دی تھیں خاص طور سے طاہرہ کے والدین کو۔ طاہرہ کے والدین کو میں ہر پریشانی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا اور اس کی وجہ صرف طاہرہ تھی۔ پورے گھر میں فوزیہ کا بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک طاہرہ تھی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی' وہ بھی شاید میری دلی واردات کو سمجھ چکی تھی' گھر میں ہنگامے ہو رہے تھے لیکن اصل شخص ابھی تک پردے میں تھا۔

"میں جہانگیر صاحب اور ہارون کی ہدایات حاصل کرتا رہتا تھا اور اسی کے مطابق کام کر رہا تھا وہ میری کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھے اور اکثر کوٹھی کے واقعات سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ یہ وقت گزرتا رہا لوگوں کی حالتیں خراب ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے لوگوں کو اپنا ساز و سامان بیچ کر ادائیگیاں کرنا پڑی تھیں' میں نے کسی سے کوئی تکلف نہیں کیا تھا' بس جہاں تک انہیں مراعات دے سکتا تھا دیتا رہا تھا۔

البتہ ان لوگوں میں سے کسی نے یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شازیہ اور نادرہ اور دوسری تمام لڑکیاں اب اسی بات سے بددل ہو گئی تھیں کہ میں کبھی ان کی طرف متوجہ رہوں گا۔ وہ بالکل ہی مایوس ہو چکی تھیں۔ لیکن بہرصورت کوششیں برابر جاری تھیں۔ پھوپی زلیخا اب بھی صدقے واری جاتی تھیں حالانکہ دلوں کا حال خدا کے ساتھ ساتھ سب پر ہی آشکارا ہو چکا تھا۔ سب کے منہ بگڑے رہا کرتے تھے۔ سب ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھتے رہا کرتے تھے۔ اور اب ہمیں دوسرے مراحل کی جانب متوجہ ہونا تھا۔

"اس دن جہانگیر صاحب سے ملاقات ہوئی تو جہانگیر اور ہارون نے ایک اور تجویز پیش کی۔" بھئی سردار علی صاحب اب آپ ایک اور کام کی بنیاد رکھ دیں اور میرا خیال ہے یہ کام بھی جلد از جلد ہو جانا چاہئے۔"

"جناب۔" میں نے سوال کیا۔

"نجمہ سے شادی۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں یہ شادی زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ہفتے تک ہونی چاہئے۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔

"م۔ مگر میں یہ سب کیسے کر سکتا ہوں۔" ؟" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا؟"

"ہوں ٹھیک ہے تو پھر دادا جان سے کہنا کہ کل میں آ رہا ہوں۔" جہانگیر صاحب نے کہا اور ہارون ہنس پڑا۔

"اب بولو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کیا عرض کروں لیکن ہارون صاحب یہ کچھ زیادتی نہیں ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کس کے ساتھ!" ہارون نے سوال کیا۔

"میرے اور میرے والدین کے ساتھ۔"

"سردار علی والدین کو تم بعد میں سمجھا دینا' اس وقت حالات اسی کے متقاضی ہیں کہ نجمہ کو زیادہ دیر تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ فوزیہ کا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے' اگر اسی وقت یہ سب کچھ نہیں کیا جاتا تو نجمہ پریشان ہو جائے گی۔" ہارون نے کہا اور میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔" ٹھیک ہے جہانگیر صاحب آپ دادا جان سے بات کریں۔ جہانگیر صاحب دوسرے دن صبح ہی آموجود ہوئے تھے۔ نجانے انہوں نے دادا جان کو کیا پٹی پڑھائی کہ دوپہر کو دادا جان نے مجھے طلب کر لیا۔ وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ تب انہوں نے سوال کیا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"جی؟" میں تعجب سے بولا۔

"بہرحال میں اس سے منحرف نہیں ہوں۔ میں وہی چاہتا ہوں ہارون بیٹے جو تمہاری خوشی ہے میں آج ہی افضال سے بات کرتا ہوں اور میرا خیال ہے ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کام مکمل کر لیا جائے۔ کیا خیال ہے آئندہ جمعہ کیسا رہے گا؟"

"دادا جان۔" میں نے گردن جھکالی اور دادا جان مسکرانے لگے۔

"بیٹے۔ میری دلی خواہش ہے کہ تمہیں سارے جہاں کی خوشیاں میسر آ جائیں۔ بس خدا تمہیں خوش رکھے۔" دادا جان نے کہا۔ یہ کوٹھی تو اب ہنگاموں کا مرکز بن گئی تھی۔ چنانچہ افضال صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد جب دادا جان نے رات کے کھانے کے بعد پھر جب میری اور فوزیہ کی شادی کا اعلان کیا تو بہت سے چمچے ، اور پلیٹیں گر گئیں۔ بہت

سے افراد نے اس کھانے کا بائیکاٹ کیا یہ پہلا شدید احتجاج تھا۔

"لیکن دادا جان کے الفاظ بہت سخت تھے۔ "جسے میرے اس فیصلے پر اعتراض ہو۔ وہ آج رات کو یہ کوٹھی چھوڑ دے۔ صبح کو میں ان لوگوں کا جائزہ لوں گا جو مجھ سے متفق ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ یہ مجلس برخاست ہوئی تھی۔ لیکن دوسری صبح سب ہی موجود تھے۔ البتہ ایک وفد دادا جان سے ملا تھا۔ اس نے سیاہ و سفید بتائے لیکن دادا جان نے سب مسترد کر دیئے۔

"شادی کی تیاریاں ہونے لگیں ان میں سب سے زیادہ خوش طاہرہ تھی اس وقت بھی وہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔" فوزیہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے پسند ہے۔"

"شکریہ۔"

"لیکن۔ یہ فیصلہ آپ نے کب کیا۔" ؟"

"بس اچانک!"

"سب کے منہ بنے ہوئے ہیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔"

"آپ اپنا خیال رکھیں ہارون بھائی کہیں کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔"

"تم بے فکر رہو طاہرہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دے دیا۔

"ہائے بے چاری ناکام لڑکیاں۔ بری حالت ہے سب کی!؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ بہر حال دیر تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا تھا پھر شادی کا دن آ گیا۔ میری کوشش سے بہت کم لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔ میں نے دادا جان سے کہا تھا کہ شادی کے بعد ایک عام تقریب کر دی جائے گی اس وقت معاملہ گھر کے لوگوں تک ہی رہے گا۔ نکاح کے وقت جہانگیر صاحب بھی موجود تھے۔ قاضی صاحب نے رجسٹر کھولا اور دولہا اور دلہن کا نام پوچھا۔

"دولہا کا نام۔ سردار علی۔ ولد محمود علی۔ لکھئے۔" جہانگیر صاحب نے کہا اور نزدیک بیٹھے ہوئے افضال صاحب کانپ کر رہ گئے دوسرے لوگ بھی منہ پھاڑ کر رہ گئے تھے۔ قاضی کا قلم چل پڑا تھا۔

"دلہن کا نام؟" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"نجمہ بیگم۔ بنت وہاب احمد۔" جہانگیر صاحب بولے۔

"جہانگیر' یہ یہ کیا لغویت ہے۔ یہ کس کا نام ہے؟" اس بار دادا جان نے دخل دیا۔

"دولہا اور دلہن کا مسعود صاحب۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ کیا بکواس ہے؟" افضال صاحب نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اسی وقت دو مہمانوں نے پستول نکال کر افضال صاحب کے سینے پر رکھ دیئے۔

"جنبش نہ کریں افضال صاحب۔ ہمارا تعلق انتظامیہ سے ہے۔ آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"میں کہتا ہوں میری کوٹھی میں یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔"

"جو کچھ ہو رہا ہے میری اجازت سے ہو رہا ہے دادا جان۔ براہ کرم آپ مداخلت نہ کریں۔" ایک آواز عقب سے ابھری اور ہارون ایک خوبصورت لباس میں اندر داخل ہوگیا۔ ایک بار پھر لوگوں پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ کبھی مجھے دیکھ رہے تھے اور کبھی ہارون کو۔ دادا جان نے سر پکڑ لیا۔

"نکاح پڑھائیں قاضی صاحب۔" ہارون بولا۔ اور قاضی صاحب کاروائی کرنے لگے۔ ہارون مسعود صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ انتہائی عجیب حالات میں نکاح ہوگیا اور نکاح کے خطبے کے بعد ہارون اٹھ کھڑا ہوا۔" اب اس ڈرامے کی تھوڑی سی تفصیل بتادوں آپ لوگوں کو! یہ کہانی بھی عام کہانیوں سے مختلف نہیں ہے۔ میرا ہم شکل دوست سردار علی ہی ہے۔ ایک نیک سیرت انسان جس نے میری بڑی مدد کی۔ حالانکہ وہ افضال صاحب کی سازش کا شکار ہوا تھا۔

"ہارون نے ابتداء سے ایک ایک بات بتانی شروع کر دی۔ لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔" اس طرح افضال صاحب کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے' ان کے بارے میں سارا ریکارڈ پولیس کو دے دیا گیا ہے اور محکمہ خفیہ کے دو افسران یہاں موجود ہیں جو اپنا فرض انجام دے چکے ہیں۔" خ ہارون نے اشارہ کیا پولیس کے افسران نے افضال صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں اور دادا جان ہارون سے لپٹے ہوئے تھے۔

عروسی کی رات بھی عجیب تھی۔ میں اور نجمہ عجیب سی کیفیات کا شکار تھے۔ میں نے نجمہ سے کہا کہ میں اسے اپنی چھوٹی سی بستی لے جاؤں گا اپنے والدین اور بہنوں سے ملاؤں گا۔ نجمہ نے فرط مسرت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میں۔ میں اپنی امی اور ابو سے کیا کہوں گی؟" وہ شرمگیں آواز میں بولی۔

"یہ ذمہ داری بھی مجھے ہی پوری کرنی ہوگی آپ فکر نہ کریں۔" میں نے کہا۔

"دوسری صبح حالات بدلے ہوئے تھے۔ افضال صاحب کی گرفتاری سے سبھی خوش تھے اور پھر ابھی تو ہارون باقی تھا۔ ٹوٹی ہوئی امیدیں پھر بندھ گئی تھیں' زنگ آلود خنجر پھر تیز کئے جا رہے تھے۔ دوسرے دن سب سے پہلے نجمہ کے والد سے ملا۔ دادا جان اور

ہارون میرے ساتھ تھے وہاب علی صاحب کو پوری تفصیل بتائی گئی اور وہ رونے لگے۔

"جو کام مجھے کرنا تھا وہ آپ لوگوں نے انجام دے دیا۔ بہرحال میری بیٹی عزت سے چلی گئی خدا کا یہی شکر کیا کم ہے؟"

"پھر میں نے چند روز کے بعد ہارون سے بات کی۔ میرا کام ختم ہوگیا ہارون صاحب!" اب مجھے گھر جانے کی اجازت دیں۔" میں نے کہا اور ہارون مجھے گھورنے لگا۔

"دادا جان سے بات کرلی ہے؟"

"میں تو ان کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔"

"بس بس غلام صاحب آیئے۔" ہارون نے کہا اور مجھے پکڑ کر دادا جان کے پاس لے گیا۔ دادا جان خوب ناراض ہوئے تھے۔

"میں کہتا ہوں ایسی فضول بات تم نے سوچی ہی کیوں.... چند روز میں ہم سب تمہاری بستی چلیں گے اور تمہارے والدین کو یہاں لے آئیں گے۔ میری خواہش ہے میری بچو.... اب تم کبھی دور نہ ہونا۔" دادا جان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے گردن جھکا دی!------

